سہ ماہی

فکر و تحقیق

نئی دہلی

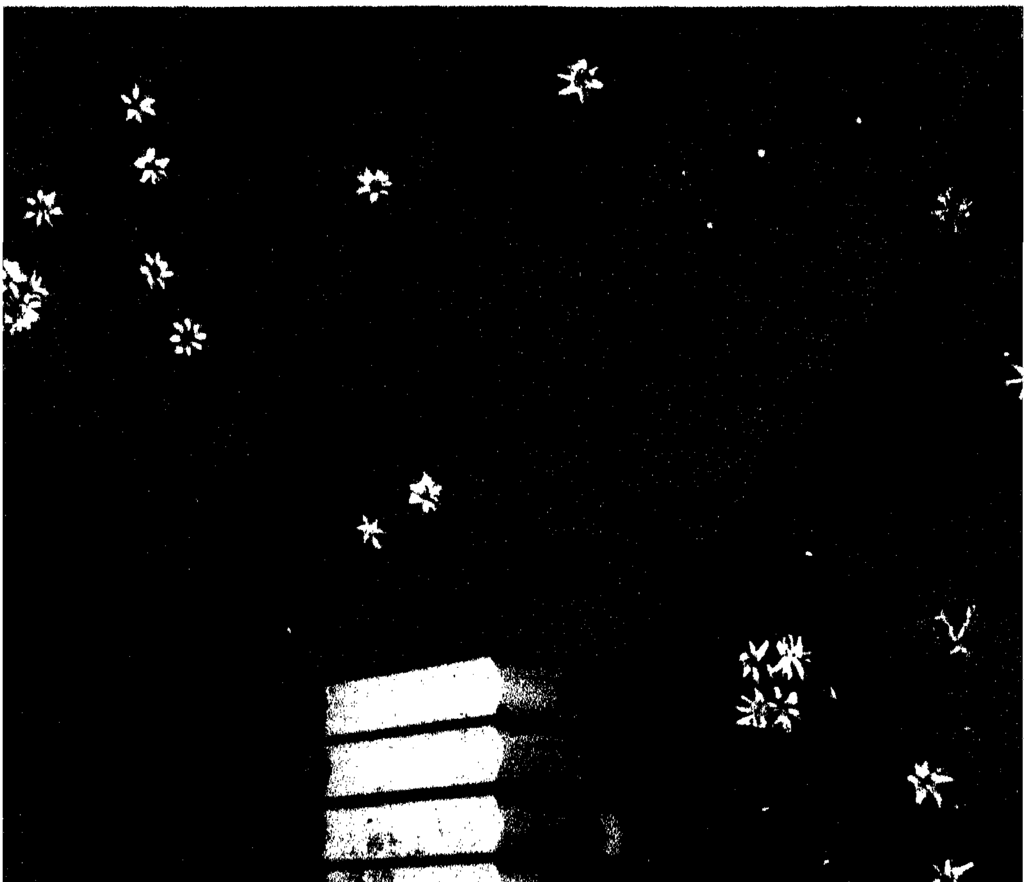

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سہ ماہی

فکر و تحقیق

نئی دہلی

جلد ۳ — شمارہ ۲

اپریل، مئی، جون ۲۰۰۰ء

مُدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

مشیر

مخمور سعیدی

مُدیر

انوار رضوی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. III April, May, June 2000 Issue - 2

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی

(علمی و تحقیقی جریدہ)

اس شمارے کی قیمت	:	25 روپے
زر سالانہ	:	100 روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے	:	140 روپے

طابع اور ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
محکمہ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی
فون-6103938, 6103381

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
مدیر : انوار رضوی
مشیر : مخمور سعیدی

فکر و تحقیق کے مشمولات میں ظاہر کردہ آرا سے قومی اردو کونسل کا اتفاق ضروری نہیں۔
فکر و تحقیق میں شامل مضامین کی نقل یا ترجمے کے لیے ناشر کی اجازت ضروری ہے۔

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے لبرٹی آرٹ پریس، دریاگنج، نئی دہلی-110002 میں چھپوا کر شائع کیا۔

ترتیب

1	ہماری بات	محمد حمید اللہ بھٹ	5
2	جہانگیر اور اس کا علمی شاہکار تزک جہانگیری	نذیر احمد	7
3	غیر معتبر روایتیں	رشید حسن خاں	41
4	اختلاف نسخ کی نشاندہی	نیر مسعود	55
5	عمل تدوین اور تدوین متون	انصار اللہ	63
6	شعر میر میں بیان اور بیان کنندہ کی نوعیت	عتیق اللہ	83
7	خان آرزو کی نوادر الالفاظ	سید محمد عبداللہ	91
8	آغا حشر کی ایک نایاب نظم 'شکریہ یورپ'	نظام الدین ایس گوریکر	113
9	اپ بھرنش اور اردو	بشیر احمد	125
10	ہندوستان کے کثیر لسانی منظر نامے میں اردو (مسائل اور امکانات کا ایک تاریخی جائزہ)	ایس۔ جمال محمد	139
11	اختر صہبائی ایک گم گشتہ شاعر	غلام نبی خیال	159

ہماری بات

"فکر و تحقیق" کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس میں شامل سبھی مضامین اہم علمی اور ادبی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد نے توزک جہانگیری کے کچھ ایسے گوشوں کو منور کیا ہے جن سے مغل دور کی تمدنی اور تہذیبی زندگی سے ہماری شناسائی تو بڑھتی ہی ہے خود جہانگیر کی ذہنی اور ذوقی ترجیحات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے قدیم متون کی تدوین کے سلسلے میں، جو ادبی تحقیق کا اہم ترین شعبہ ہے، پیش آنے والی ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو غیر معتبر روایتوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں اور ان روایتوں کی پرکھ کا کیا طریق کار ہو، اس سے بھی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود تخلیقی فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نقاد بھی ہیں، انھوں نے قدیم متون کے مختلف نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات کی نوعیت اور ان اختلافات کے پیدا کردہ مسائل سے مختصر مگر جامع بحث کی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ کا موضوع گفتگو بھی تدوین و تحقیق کے مسائل ہی ہیں۔ ان کا مضمون ان مسائل پر ایک اور رخ سے روشنی ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر عتیق اللہ نے "شعر میر میں بیان اور بیان کنندہ کی نوعیت" کے عنوان سے خدائے سخن میر تقی میر کی شاعری کو ایک نئی نہج سے موضوع گفتگو بنایا ہے۔ خان

آرزو اپنے عہد کی ایک اہم شخصیت تھے، میر کی پرورش و پرداخت میں بھی ان کا حصہ رہا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے، شعر و ادب کے پارکھ بھی اور مدوّنِ لغات بھی۔ سید عبداللہ نے اپنے مضمون میں ان کی مرتب کردہ لغت "نوادر الالفاظ" کا بھرپور تعارف کرا لیا ہے اور خود ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ آغا حشر ڈراما نگار کے طور پر زیادہ مشہور و مقبول ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اردو ڈرامے کو ایک ایسا رنگ و آہنگ دیا جو ان سے پہلے کے ڈراما نگاروں کے یہاں نہیں ملتا لیکن وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے، ان کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار ان کے ڈراموں میں بھی ہوا ہے۔ جناب نظام الدین ایس گوریکر نے ان کی ایک نظم "شکریۂ یورپ" کا تعارف کرایا ہے۔ یہ نظم جب شائع ہوئی تو اس نے تہلکہ مچا دیا تھا مگر اب یہ بآسانی دستیاب نہیں۔ ہم گوریکر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کے توسل سے یہ نظم "فکر و تحقیق" کے قارئین تک پہنچ رہی ہے۔

جناب بشیر احمد نے اپ بھرنش اور اردو کے باہمی رشتوں سے جو بحث کی ہے وہ دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔ جناب ایس جمال محمد نے اسی موضوع کو ذرا پھیلا دیا ہے اور ہندستان کے کثیر لسانی منظر نامے میں اردو کی شناخت کے مسائل اور اس کی ترویج و ترقی کے امکانات کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ ہم ان مضامین پر قارئین کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن: جناب غلام نبی خیال نے ماضی قریب کے ایک شاعر اثر صہبائی کی یادیں تازہ کی ہیں جو ایک امر مستحسن ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اہل اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اُردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیاروں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے

۳۲ علوم پر مشتمل

تین جلدیں شائع ہو گئیں

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے اُردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں ۳۲ علوم پر مشتمل ہیں۔ جن کی ترتیب حسبِ ذیل طریقے پر کی گئی ہے۔

جلد اوّل : ۱۔ آثار قدیمہ ۲۔ ادبیات ۳۔ ارضیات ۴۔ انجینیرنگ
۵۔ تاریخ اسلام ۶۔ تاریخ عالم ۷۔ تاریخ ہند

جلد دوم : ۸۔ تعلیم ۹۔ جغرافیہ ۱۰۔ جنگلات ۱۱۔ حیاتیات
۱۲۔ حیوانیات ۱۳۔ ریاضیات ۱۴۔ زراعت ۱۵۔ سائنس
۱۶۔ سماجیات ۱۷۔ سیاسیات ۱۸۔ طب یونانی ۱۹۔ طبیعیات

جلد سوم : ۲۰۔ علاج حیوانات ۲۱۔ فلسفہ و نفسیات ۲۲۔ لائبریری سائنس ۲۳۔ فلکیات
۲۴۔ فنون لطیفہ ۲۵۔ قلم ۲۶۔ قانون ۲۷۔ کیمیا
۲۸۔ مذاہب ۲۹۔ معاشیات ۳۰۔ معدنیات ۳۱۔ نشر و اشاعت
۳۲۔ نظم و نسق

جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشین پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔

جلد اوّل	578 صفحات	قیمت	-/300روپے
جلد دوم	568 صفحات	قیمت	-/450روپے
جلد سوم	614 صفحات	قیمت	-/450روپے

مندرجہ ذیل پتے پر لکھیں یا کسی کتب فروش سے حاصل کریں

قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

نذیر احمد

جہانگیر اور اس کا علمی شاہکار
توزکِ جہانگیری

جہانگیر بڑا علم پرور حکمراں گزرا ہے، اس کی تعلیم بھی بڑے بڑے فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، اس کا باپ اکبرِ اعظم تھا جو تعلیم کی نعمت سے محروم رہا لیکن علم کی عظمت کا اس کو پورا احساس تھا، اس لیے جب یہ بچہ بڑی تمناؤں اور دعاؤں سے پیدا ہوا تو باپ نے اس کی بہترین تعلیم کا انتظام کیا چنانچہ بڑے ہو کر جہانگیر نے سارے علوم و فنون میں بڑی دستگاہ پیدا کی جس میں اس کی ذہانت نے چار چاند لگائے اور واقعی وہ علم و فن کے آسمان پر آفتاب کی تابناکی کے ساتھ چمکا۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا، فارسی، عربی کے علاوہ ترکی پر اس کو پوری قدرت تھی۔ فارسی میں شعر کہتا تھا، نثر انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہوتی تھی، اس کا علمی شاہکار توزکِ جہانگیری ہے جو جہانگیر کی ہمہ جہت شخصیت کا ایسا آئینہ ہے جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتی، اس کی طرز و روش بھی بے حد دلچسپ ہے، جو سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کا ایسا مرقع ہے جس کے نمونے فارسی ادب میں کم ملتے ہیں، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جہانگیر واقعات کو ایسے بے تکلف برجستہ اور دل آویز طریقے سے ادا کرتا ہے کہ بڑے بڑے انشاپرداز اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں، جب وہ کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کا ذکر کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم میدانِ کارزار میں کھڑے ہوئے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستانِ عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس کی ساری رنگینیاں و سرمستیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، جب کسی مقام کا ذکر کرتا ہے تو ایک محقق جغرافیہ داں کی طرح ساری معلومات فراہم کردیتا ہے جب کسی شہر کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات تحریر کرتا ہے تو

وہ ایک مورخ معلوم ہوتا ہے جب پھولوں پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات بیان کرتا ہے تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

کشمیر کو دیکھتا ہے تو اس کے کیف آور مناظر کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعۂ یست آہنی حصار، بادشاہان را گلشنی است عشرت افزا و درویشان را خلوت کدۂ دلکشا، چمنہای خوش و آبشارہای دلکش، از شرح و بیان افزون، آبہای روان و چشمہ سارہا از حساب و شمار بیرون، چندانکہ نظر کار می کند سبزہ است و آب روان، وگل سرخ و بنفشہ و نرگس خودرو صحرا صحرا، انواع گلہا و اقسام ریاحین ازان بیشتر است کہ بشمار در آید، در بہار کوہ و دشت از اقسام شگوفہ مالامال، در و دیوار و صحن و بام خانہ ہا از مشعل لالہ بزم افروز۔

جہانگیر شعر و شاعری کا دلدادہ تھا، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تو بہت خوب کہتا۔ ایک غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہوں[1]:

من چون کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد	تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ می خرام دوست تو عالمی	اسپند میکنم کہ مباد انظر رسد
در وصل دوست مستم و در ہجر بیقرار	داد از چنین غمی کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہ وصال	فریاد ازان زمان کہ مرا این خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر	امید آنکہ مشعلۂ نور اثر رسد

(ترجمہ اردو تزک، ج ۱، ص ۲۸۰)

جہانگیر جب کسی شعر کے جواب میں شعر لکھتا تو بہت خوب لکھتا تھا، ایک دفعہ امیر الامرا کا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق	یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

---

[1] جمعہ کے دن ۱۳ رمضان ۱۰۱۸ھ کو میرے دل میں چند خیالات آئے اور اس غزل کی صورت میں ڈھل گئے۔ اردو ترجمہ تزک، ج ۱، ص ۲۷۹

توجہانگیر نے[1] یہ شعر موزوں کیا:

از من متاب رخ کہ نیم بی تو یک نفس　　　　یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

ابراہیم عادل شاہ کو ایک تصویر بھیجی، اس پر یہ رباعی اپنے ہاتھ سے لکھی:

ای سوی تو دایم نظر رحمت ما　　　　آسودہ نشیں بسایۂ دوست ما
سوی تو شبیہ خویش کردیم روان　　　　تا معنی ما ببینی از صورت ما

خرم کے دولت خانے کے باغیچے میں ایک حوض اور چبوترہ تھا، چبوترے کے کونے پر مولسری کا درخت تھا جس سے ٹیک لگا کر لوگ بیٹھتے تھے، درخت کا منہ ایک طرف کھوکھلا تھا، جہانگیر نے سنگِ مرمر کی تختی سے کھوکھلے کو پُر کرا دیا اور اس پر یہ شعر بطور یادگار لکھ دیا۔

نشیمن گاہ شاہ ہفت کشور　　　　جہانگیر ابن شاہنشاہ اکبر

(ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۳۹)

جہانگیر کو بہت سے اشعار ازبر تھے، ان کو موقع بموقع نقل کرتا تھا، سنہ ۱۴ جلوس میں منداور کے قریب فروکش ہوا، وہاں ایک ستون پر یہ رباعی دیکھی تو اس سے بے حد متاثر ہوا (مرا از جا درآورد، الحق از شعرہای خوب است)

یاران موافق ہمہ از دست شدند　　　　در دست اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر　　　　یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

اسی وقت اسی قسم کی ایک دوسری رباعی سنی گئی جو بہت خوب تھی اسی وجہ سے لکھی جاتی ہے:

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند　　　　از خاطر ہمدمان فراموش شدند
آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند　　　　آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

جہانگیر کے اعلیٰ ذوقِ سخن کے بیسوں واقعات توزکِ جہانگیری میں منقول ہیں، دو

---

[1] ترجمہ اردو توزک، ج ۱، ص ۲، ۳؛ چونکہ میری طبیعت موزوں ہے، کبھی آورد سے، کبھی بے ساختہ مصرع، رباعی یا شعر موزوں کر لیتا ہوں، اسی وقت بے اختیار یہ شعر میری زبان پر آگیا، امیر الامرا کا نام شریف خاں تھا، توزک اس کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔

ایک مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

۲۷ ذی الحجہ ۱۰۱۶ کو خرم کے ماموں راجہ سورج سنگھ نے مشہور امرا کے چچازاد بھائی شیام کو ساتھ لاکر شرف باریابی حاصل کیا، راجہ سورج سنگھ اپنے ساتھ ایک ہندی شاعر بھی لایا تھا، اس نے جہانگیر کی مدح میں جو شعر کہے ان کا مفہوم یہ تھا: اگر سورج کے کوئی بیٹا ہوتا تو دنیا میں ہمیشہ دن رہتا، رات کبھی نہ ہوتی اس لیے کہ سورج کے غروب ہو جانے پر اس کا بیٹا جانشین ہوتا اور دنیا کو روشن رکھتا، خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے آپ کے باپ کو آپ جیسا فرزند عطا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی وفات کے بعد لوگ ان کے ماتم کے غم سے جو رات کے مانند ہے محفوظ ہے' آفتاب آپ پر رشک کرتا ہے اور سوچتا ہے کاش میرے بھی کوئی بیٹا ہوتا جو میرا قائم مقام ہو کر دنیا میں رات نہ ہونے دیتا اور اسی طرح دنیا کو روشن بناتا جس طرح آپکے طالع کی روشنی اور انصاف کے نور نے باوجود آپ کے والد کے انتقال جیسے المناک واقعے کے، دنیا کو روشن بنائے رکھا ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کا نام و نشان نہیں رہا۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ یہ مضمون آفرینی اور نازک خیالی میں نے ہندوستان کے شعرا میں کم دیکھی ہے، میں نے اس طرح کے صلے میں اس کو ایک ہاتھی عنایت کیا۔ زمانۂ حال کے ایک شاعر نے اسی مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

گر پسر داشتی جہان افروز — شب نگشتی ہمیشہ بودی روز
زانکہ چون او نہفتہ افسر زر — بنمودی کلاہِ گوشہ پسر
شکر کز بعد آنچنان پدری — جانشین گشت این چنین پسری
کز شنفتار گشتن آن شاہ — کس بماتم نکرد جامہ سیاہ

(ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۵۳-۲۵۴)

بھونرا کنول اور نیلوفر کے پھولوں میں دن و رات چمٹا رہتا ہے اس لیے شاعروں نے بلبل کی طرح بھونرے کو ان پھولوں کا عاشق قرار دیا ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ تان سین کلاونت نے جو اکبر کا درباری تھا اور اس زمانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ملتا' اپنے ایک نقش

(راگ) میں محبوب کے چہرے کو آفتاب سے اور اس کے آنکھ کھولنے اور بند کرنے کو کنول کے پھول کھلنے اور اس میں سے بھونرے کے نکلنے سے تشبیہ دی ہے اور دوسرے نقش میں محبوب کے کن انکھیوں سے دیکھنے کو اس تھرتھراہٹ سے تشبیہ دی ہے جو کنول پر بھونرے کے بیٹھنے کے وقت پیدا ہوتی ہے (ترجمہ اردو ج ۱ ص ۳۴۵-۳۴۶)

ایسا ذوقِ سخن رکھنے والا جب طالب آملی کے شعر سے چند اشعار منتخب کرتا ہے تو اہل نظر کے نزدیک اس سے بہتر اشعار کا تصور نہیں ہو سکتا، اشعار ملاحظہ ہوں :

زغارت چمنت بر بہار منتہاست　　　　که گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

لب از گفتن چنان بستم که گوئی　　　　دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

عشق درّ اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع　　　　این شرابی است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

گر من بجای جوہر آئینہ بودمی　　　　بی رونما ترا بتو کی می نمودمی

دو ب دارم یکی درمی پرستی　　　　یکی در عذر خواہی ہای مستی

(ترجمہ اردو توزک، ج ۲، ص ۱۴۸-۱۴۹)

جہانگیر کو فنونِ لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی، اس کو مصوری، خطاطی سے خصوصی تعلق تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ فنِ مصوری میں اس کا ذوق اور اس کی مہارت اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ وہ اس فن کے استادوں سے بڑھ گیا ہے، 'اب حالت یہ ہے کہ کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر میرے سامنے لائی جائے تو میں بغیر اس کا نام جانے ہوئے بتا دوں گا کہ فلاں مصور کا کام ہے، بلکہ اگر وہ تصویر گروپ ہو اور وہ تصویر چند چہروں پر مشتمل ہو اور ہر چہرہ الگ الگ استادوں کا بنایا ہوا ہو تب بھی میں بتا سکوں گا کہ یہ چہرہ کس کا بنایا ہوا ہے، اگر ایک چہرے میں آنکھیں اور بھویں کسی دوسرے کی بنائی ہوئی ہوں تو میں بتا سکتا ہوں کہ اصل چہرہ کس مصور کا بنایا ہوا ہے اور آنکھیں اور بھویں کس مصور کی بنائی ہوئی ہیں، خواہ وہ مصور معاصر

ہوں یا گذرے ہوئے زمانے کے۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۶ ـ ۲۷)

جہانگیر لکھتا ہے کہ ۲۴ تیر ماہ ۱۰۲۷ کو اس نے ابوالحسن مصوّر کو نادرزماں کے خطاب سے سرفراز کیا، ابوالحسن نے جہانگیر نامے کے دیباچے میں شامل کرنے کے لیے جہانگیر کی تخت نشینی کی مجلس کی تصویر بنا کر اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تصویر لائقِ تحسین تھی اس لیے بادشاہ نے اس کے ساتھ انتہائی لطف و کرم کا سلوک کیا، نادرزماں کا فن کمال کو پہنچ چکا ہے اور اس کی تصویر اس دور کے بہترین کارناموں میں ہے، اگر آج کے دن استاد عبدالحی اور استاد بہزاد موجود ہوتے تو وہ اس کے فن کی صحیح داد دیتے، اس مصوّر کا باپ آقا رضا مروی جہانگیر کی شاہزادگی کے زمانے میں اس سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے فن کو اس کے باپ کے فن سے کوئی نسبت نہیں، چونکہ جہانگیر (سلیم) نے اس کی تربیت کی ہے، اس لیے بادشاہ کے اُس پر بہتیرے حقوق ہیں۔ مصوّر کے بچپن سے آج تک بادشاہ نے اس کی تربیت کی فکر کی، اب وہ فن کی بلندیوں تک پہنچ گیا ہے، بلا شبہ وہ اس زمانے کے نادرِ روزگار لوگوں میں ہے۔ استاد مصوّر نقاش بھی جسے نادرالعصر کا خطاب مل چکا ہے۔ اپنے فن میں یگانۂ عصر ہے، میرے والد اور میرے عہدِ حکومت میں یہ دونوں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ (ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۲۹)

۶ ذی الحجہ ۱۰۱۷ کو مقرب[ل] خاں نے ایک تصویر بھیجی جس کے بارے میں اہلِ یورپ کا خیال ہے کہ یہ امیر تیمور کی تصویر ہے، یہ اس وقت کی ہے جب سلطان ایلدرم بایزید تیمور کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا، اس وقت استنبول کے عیسائی حاکم نے تحفے تحایف کے ساتھ تیمور کی خدمت میں ایک ایلچی بھیجا تھا، اس کے ہمراہ ایک مصوّر تھا جس نے امیر تیمور کی یہ تصویر بنائی تھی، یہ دعویٰ اہلِ یورپ کا ہے۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو جہانگیر کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی تحفہ عزیز نہیں ہو سکتا لیکن یہ تصویر امیر تیمور سے یا اس کے خاندان کے کسی اور فرد سے نہیں ملتی اس لیے مجھے (جہانگیر کو) اہلِ یورپ کے اس دعویٰ کا یقین نہیں۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۶۷)

[ل] شیخ حسن نام تھا، کیرانہ کا رہنے والا تھا، دیکھ ماثر الامرا، ج ۳، ص ۳۷۹ ـ ۳۸۱

خان عالم جو شاہ عباس کے پاس بطور سفیر بھیجا گیا تھا بہمن ۱۰۲۸ میں جہانگیر کے پاس واپس آیا اور اپنے ساتھ نادر تحفے لایا، ان میں امیر تیمور کی جنگ کی تصویر تھی، یہ مرقع ۲۴۰ تصویروں کا مجموعہ ہے، یہ تصویریں امیر تیمور اور اس کی اولاد اور ان امرا کی ہیں جو جنگ میں شامل تھے، ہر تصویر کے نیچے اس کا نام لکھا ہوا تھا، مصوّر کا نام خلیل مرزا شاہ رخی ہے جس کے فن میں نہایت پختگی اور ہنر مندی کا کمال موجود ہے، استاد بہزاد کے فن سے اس کا فن بہت مماثلت رکھتا ہے اس لیے گمانِ غالب ہے کہ بہزاد اس کے شاگردوں میں ہوگا۔ یہ گرانقدر تحفہ شاہ اسماعیل اوّل یا شاہ طہماسپ کے کتب خانے سے منتقل ہوکر شاہ عباس کے کتب خانے میں پہنچا، وہاں سے صادق نامی کتابدار نے چرا کر کسی آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیا، اتفاق سے اصفہان میں یہ تصویر خان عالم کے ہاتھ لگی، شاہ عباس کو اس کی اطلاع مل گئی، اس نے اس تصویر کے دیکھنے کے لیے شاہ عالم سے بڑی منت وساجت کی، مجبوراً سفیر نے یہ تصویر شاہ عباس کے پاس بھیج دی، شاہ عباس پہچان گیا کہ یہ وہی تصویر ہے جو اس کے کتاب خانے سے غائب ہوگئی ہے، بہرحال شاہ نے یہ تصویر خان عالم کو واپس کر دی۔

خان عالم کے ساتھ بشن داس مصوّر بھی بھیجا گیا تھا کہ وہ شاہ عباس اور اس کے ارا کین دولت کی تصویریں کھینچ کر اپنے ساتھ لائے، اس نے متعدد تصاویر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیں جو سب قابلِ قدر تھیں، لیکن سب سے زیادہ خوبصورت تصویر شاہ عباس کی تھی، بشن داس کو ہاتھی انعام میں ملا۔ (ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۱۴۶-۱۴۷)

جہانگیر کے عہد کا ایک اور مشہور مصوّر فرخ بیگ تھا (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۸۰) اس کی کھینچی ہوئی تصویریں دنیا کے مختلف عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

جہانگیر کو خطاطی سے کافی دلچسپی تھی، محمد حسین کشمیری اس دور کا مشہور خطاط تھا، محمد حسین کو اکبر نے زرین قلم کا خطاب دیا تھا، اکبر کے زمانے ہی میں نستعلیق خط میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا، نستعلیق نویسی میں وہ اپنے استاد مولانا عبدالعزیز سے سبقت لے جا چکا تھا۔ بعض نقادوں کی نظر میں وہ مُلّا میر علی کے مقابل تھا، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس کی بڑی تعریف کی ہے (بلوخمین، ج ۱، ص ۱۰۹)

توزک میں اس کا ذکر دوبار ہے، پہلی بار جنگ پورہ میں ۱۰۱۵ھ میں پڑاؤ کے

موقع پر جب سراج نامی ہرن کی قبر پر ایک منارہ تیار ہوا تھا۔ منار کے ایک پتھر پر محمد حسین کشمیری نے جو اس زمانے کے سربرآوردہ خوش نویسوں میں ہے، یہ عبارت لکھی تھی۔

دریں فضائے دلکش آہوی بدام جہاندار خدا آگاہ نورالدین جہانگیر بادشاہ آمدہ در عرض یک ماہ از وحشت صحرائیت برآمدہ سرآمد آہوانِ خاصہ گشت،

جہانگیر مزید لکھتا ہے:

بنابر ندرت آہوی مذکور حکم کردم کہ ہیچکس قصد آہوان این صحرا نکند و گوشت آسنا بر ہندو و مسلمان حکم گوشت گاو و گوشت خوک داشتہ باشد و سنگ قبر او را بصورت آہو مرتب ساختہ نصب کنند۔ (ترجمہ، ج ۱، ص ۱۹۰)

اواخر رمضان یا اوائل شوال ۱۰۱۸ھ میں محمد حسین کاتب کو ایک ہاتھی مرحمت ہوا (ایضاً، ج ۱، ص ۲۸۱)

محمد حسین زرین قلم جس کا کمال ہنرمندی نستعلیق نویسی میں ظاہر ہوا، اس کے کمالِ فن کی متعدد یادگاریں باقی ہیں، خدابخش پٹنہ میں دیوان حسن دہلوی کا وہ نسخہ موجود ہے جو شیخ فرید بخاری کے لیے ۱۰۱۰ھ میں تیار کیا تھا، اسی کتاب خانے میں ایک مجموعہ زرین قلم کے خط میں موجود ہے (مخطوطاتِ فارسی شمارہ ۱۰۹۰)، بوڈلیان لائبریری میں بہارستان جامی کا محمد حسین کے خط میں موجود ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں گلستان کا نسخہ محمد حسین زرین قلم کے خط میں ہے، اس کے خاتمے پر محمد حسین کی تصویر منوہر مصوّر کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے، یہ نسخہ ۹۹۰ھ میں فتحپور میں تیار ہوا تھا۔ جہانگیر کے مرقع گلشن کے باقی ماندہ اوراق میں اس کے خط کے نمونے موجود ہیں، مرقع کی ایک تصویر جو پراگ میوزیم میں ہے، اس کے اوپر اور نیچے محمد حسین کی تحریر موجود ہے جو ۱۰۱۹ھ میں لکھی گئی گویا کاتب کے مرنے کے ایک سال پہلے۔ (دیکھیے راقم کا مضمون شامل ایران سوسائٹی سلور جبلی نمبر (۱۹۷۰ء) ص ۱ بعد)

اسی دور کے ایک اور کاتب میر عبداللہ مشکیں قلم تھے، وہ جہانگیر کے ساتھ جب وہ باپ سے ناراض ہو کر الہ آباد چلا گیا تھا، الہ آباد میں موجود تھا۔ اس کی وفات آگرہ میں ۱۰۲۵ھ میں ہوئی اور اس کا مختصر سا تبدرہ سکندرہ بائی پاس کے کنارے

آگرہ کے ایک دور افتادہ مقام جواہر نگر میں موجود ہے، مقبرہ کی دیواروں پر اس کے بیٹے میر صالح کشفی کی کہی ہوئی وفات کی تاریخ مندرج ہے۔

میر عبداللہ فارسی کے شاعر تھے جنھوں نے نظامی کے خمسے کا جواب لکھا ہے، اس میں سے مثنوی گلشن اسرار جو مخزن الاسرار کے جواب میں ہے، سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے (فہرست ج ۵، ص ۱۲۰-۱۲۱، مخطوطہ شمارہ ۱۸۴۷)، اس نے سلطان سلیم کی بیگم شاہ بیگم (مادر خسرو) کی وفات (۱۰۱۲ھ) پر قطعہ کہا تھا جو مرحومہ کی قبر پر الہ آباد (خسرو باغ) میں موجود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتبہ مرحومہ کی قبر پر جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد لگایا گیا ہوگا، اس لیے کہ کاتب کا نام اس طرح ملتا ہے:

لکاتبہ عبداللہ مشکین قلم جہانگیر شاہی۔ دیکھیے کتاب W.E.Beglay

Monumental Islamic Calligraphy Islamic Foundation, Villa Park, Illinus U.S.A., 1985

شمارہ-۵۲۔

ان کی خطاطی کا نمونہ دیوان حسن دہلوی کی شکل میں امریکا کے شہر بالٹی مور کی Walters Art Gallery میں محفوظ ہے۔ کتابت کی تاریخ ۲۷ محرم ۱۰۱۱ھ مقام الہ آباد ہے، نسخہ مصوّر ہے، سرورق پر خود عبداللہ مشکیں قلم کی تصویر ہے۔ عبداللہ مشکیں قلم کے چند خط کا ایک مختصر سے مجموعہ کا عکس میرے ایک دوست نے بمبئی سے بھیجا ہے۔ میر عبداللہ کی وفات ۱۰۳۵ھ میں آگرہ میں ہوئی جہاں ان کا مزار[1] ہے۔ میر عبداللہ کا ذکر ابو الفضل نے آئین میں نستعلیق نویسوں کے ساتھ کیا ہے۔ (ترجمۂ آئین اکبری، ج ۱، ص ۱۰۹)

جہانگیر کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کا سب سے قابلِ توجہ ثبوت جہانگیر کی مرتبہ کتاب مرقع گلشن[2] سے فراہم ہوتا ہے، اس مرقع کے بیشتر اوراق ایران کے سلطنتی میوزیم

---

[1] مزار پر جو کمرہ ہے اس کی دیواروں پر مشکیں قلم کے بڑے بیٹے میر صالح کشفی کے ہاتھ کے دو کتبے درج ہیں، ان کتبوں سے واضح ہے کہ یہ کمرہ خود عبداللہ مشکیں قلم کے زمانے کا ہے۔ مشکیں قلم کے دوسرے بیٹے میر مومن عرشی صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کا دیوان اور مثنویات کے نسخے موجود ہیں۔

[2] یہ جہانگیر کا ذاتی البم تھا اس کا مکمل نسخہ ناپید ہے۔ کچھ منتشر اوراق مغرب و مشرق کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے تقریباً ۱۲۰ اوراق کا پتہ چلا ہے۔ اس میں ۸۸ ورق تہران کے عجائب خانے میں گلشن البم کے نام سے ہیں، اس البم کے ۵۰ ورق جو بعد آخرید ے گئے تھے وہ پراگ میوزیم کو ہدا کر دیے گئے، البم کا ایک جز ۱۱ ورق پر مشتمل برلن لائبریری میں ہے۔

میں تھے، اس کا ایک ورق چیکوسلواکیہ کے پراگ میوزیم میں ہے، اس ورق پر ابراہیم عادل شاہ کی ایک دلکش تصویر ہے، مصوّر کا نام فرخ بیگ اور کاتب محمد حسین کشمیری ہے تصویر کے بالائی حصّے میں یہ تحریر ہے:

اللہ اکبر شبیہ ابراہیم عادل خان دکنی طرفدار بیجاپور کہ درعلم موسیقی دکن خود را سرآمد اہل آن فن می داند

تصویر کے زیریں حصّے کی عبارت یہ ہے:

وعمل فرخ بیگ فی سنتہ ۵ جلوس مبارک موافق ۱۰۱۹ھ
بندۂ کمترین محمد حسین زرین قلم جہانگیر شاہی تحریر نمود

یہ تصویر سب سے پہلے ایک محقق لوریر ہایک نے اپنی کتاب: Indian Miniature of the Mughal School, London, 1960 میں چھاپی تھی، اس کتبے کی قرأت کے سلسلے میں کتاب ہذا میں کافی غلطیاں تھیں، راقم نے اپنے ایک مقالہ میں انڈوایرانیکا کلکتہ ج ۳۰، شمارہ ۱-۲ میں ان کی وضاحت کردی تھی، دوبارہ اسی سلسلے میں ایک دوسرا مقالہ ایران سوسائٹی کے سلور جبلی Souvenir میں شائع کیا، اس کے بعد مشرق و مغرب میں اس تصویر پر مقالات کی بھرمار ہوئی لیکن اس تصویر سے متعلق جو شبہات یورپی محققین کے پیدا کیے ہوئے ہیں وہ رفع نہیں ہوئے حالانکہ مشہور محقق کرل کھنڈل والا نے میرے نقطۂ نظر کی بھرپور تائید کرتے ہوئے مارک زبراوسکی کی کتاب دکنی Paintings پر تبصرہ کے دوران لکھا ہے:

1."The best known instance is the theory that the Innghal artist Farrukh Begh worked for some time in the Deccan through the learned Persian scholar Prof. Nazir Ahmed has cogently demonstrated how well nigh impossible it is to support this theory and the present reviewer has elaborated Nazir Ahmad's conclusion still further in a recent article to be published in the O.C.Gangoli Commemoration------ In this connection it may be noted that the Parague Study of Ibrahim Adil Shah II playing the Tambur (Col Pl. X) was definitely painted at Agra in A.D.1610 by Farrukh Begh for Jahangir. The inscriptional evidence is irrefutable on this point,as established by Prof. Nazir Ahmad and no amount of ingenuity can after this fact."

2.Lalit Kala,No.21,pp. 35-36.
Nazir Ahmad:The Innghal Artist Farrukh Begh,
Islamic Culture Vol. 35,No.1,pp.115-139.

جہانگیر کے دَور کا ایک مشہور خطاط عبدالحق شیرازی ہے، جہانگیر کے حکم کے بموجب اس نے سکندرہ میں اکبر کے مقبرے کے دروازہ پر ۱۰۲۲ھ میں کتبے لکھے ہیں اس وقت اس کا نام عبدالحق شیرازی ملتا ہے، پھر اس نے آگرہ کی مدرسہ مسجد کی تعمیر میں اپنا نام عبدالحق امانت خاں شیرازی لکھا، اور تاج محل کے کتبے میں صرف امانت خاں شیرازی ہے، تاج محل کے انھیں کتبات کی وجہ سے امانت خاں شیرازی زندۂ جاوید ہو گیا ہے، عبدالحق شاہجہان کے دیوان کل افضل خاں کا بھائی تھا۔ امانت خاں کا تیسرا زندہ و پائندہ کارنامہ ایک سرائے کی تعمیر ہے جو ۱۰۵۰ ہجری میں ایک شاہراہ کے کنارے تعمیر کی جو لاہور کو دہلی اور آگرہ سے ملاتی ہے، یہ جگہ اب سرائے امانت خاں کے نام سے مشہور ہے اور اس کا کتبہ بھی محفوظ ہے۔ تاریخ چاردہم سال جلوس مبارک مطابق سال ہزار و پنجاہ ہجری ہے۔ پورے کتبے کا انگریزی ترجمہ اس طرح ہے۔

I have found this Seraian this land for the comfort of God's creatures having completed it on this date the 14th years of the auspicious accession of His Majesty (Shah Jahan) corresponding to the Hijra year one Thousand and fifty. I wrote this inscription with my own hand by way of remembrance.

سرائے امانت خاں لاہور سے مشرق میں ایک روز کے سفر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت ۱۶۳۹ء میں وہ یہیں منتقل ہوا تھا۔

جہانگیر کی سیرت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مخطوطات کا بڑا شوق تھا، وہ ایسے مخطوطات کا بڑا شائق تھا جو علمی، فنی، تہذیبی، تاریخی و تزئینی خصوصیات کے حامل ہوتے، ایسا خیال ہوتا ہے کہ جب کوئی مخطوطہ وہ خریدتا تو اس کو اپنی یادداشت سے مزین کرتا تھا، اور اب بھی دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں ایسے مخطوطات مل جاتے ہیں جو جہانگیر کی تحریر سے مزین ہیں، اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایسے مخطوطات جمع کیے جائیں جس پر جہانگیر کی تحریر ہے تو وہ کئی سو تک پہنچ

لہ See Monumental Islamic Calligraphy P.102-104, No.58

کہ Monumental Islamic Calligraphy P.16-18

جائے گی اور اس سے اس بات کا ثبوت فراہم ہو سکے گا کہ دنیا کا کوئی بادشاہ اتنا کتابوں کا عاشق نہ تھا جتنا جہانگیر اور آج بھی جتنی کتابیں اس کے دستخط سے مزین ہیں کسی بادشاہ یا کسی صاحب علم کے قلم کی یادگار نہ ہوں گی۔

جہانگیر سائنسی ذہن لے کر آیا تھا، وہ علمی مشاہدے اور ذاتی تجربے کا بڑا شوق رکھتا تھا، توزک جہانگیری میں اس کے علمی تجربے و مشاہدے کے سینکڑوں واقعات درج ہیں اور ان میں اتنا تنوع ہے کہ اگر وہ سب جمع کیے جائیں تو ایک اچھی خاصی دلچسپ کتاب مرتب ہو سکتی ہے، اس میں چڑیوں کا بیان اتنا متنوع ہے کہ اس سے فن طایر شناسی Ornithology میں مفید اضافہ ہو سکتا ہے سنا ہے کہ مشہور طایر شناس ڈاکٹر سالم علی نے جہانگیر کو اس فن میں جو دسترس تھی اس پر ایک عالمانہ خطبہ دیا تھا، کچھ عرصہ ہو رہا ہے مجھے ایک ماہر فن نے خط لکھا کہ توزک میں سفید باز کا ذکر کس طرح آیا ہے، چونکہ مجھے اس فن کی کوئی واقفیت نہیں ہے، میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ اسی ضمن میں معلوم ہوا کہ بعض چڑیوں کا سب سے قدیم ذکر توزک ہی میں ملتا ہے۔ چڑیوں کے بارے میں کچھ اطلاعات توزک کے حوالے سے درج کی جاتی ہیں:

کویلؔ کی خاصیت ہے کہ خود انڈا دینے اور سینے کے لیے گھونسلا نہیں بناتی، کوّے کے گھونسلے میں انڈا دیتی ہے اور کوّے کے انڈے توڑ کر گرا دیتی ہے، کویل تو انڈا دے کر اڑ جاتی ہے اور مادہ کوّا اسے اپنا انڈا جان کر سیتی ہے۔ (ترجمہ، ج ۲، ص ۱۲)

لہ کویل کے بارے میں چند اور خصوصیات ہیں، وہ جثے میں کوّے سے چھوٹی ہوتی ہے، کوّے کی آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں اور کویل کی سرخ، مادہ کویل کے جسم پر چھوٹے چھوٹے نقطے ہوتے ہیں، نر کویل خوش آواز ہوتی ہے، کویل ہندوستان کی بلبل ہے، کویل کا نالہ و فغاں برسات کے دنوں میں جو ہندوستان کا موسم بہار ہے بہت تیز ہو جاتا ہے، اس کی مستی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب آموں کا موسم شروع ہوتا ہے، کویل زیادہ تر آموں کے درختوں پر بیٹھتی ہے اور آموں کے رنگ و بو سے محظوظ ہوتی ہے۔

(ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۱۲)

قاسم دہ بیدلہٰی نے ماوراءالنہر سے پانچ سفید باز بھیجے تھے، ان میں سے ایک مرگیا اور چار سلامتی سے اوجین پہنچے، اسی زمانے میں خان عالم نے جو جہانگیر کا سفیر تھا، ایران سے ایک آشیانی باز جسے فارسی میں اکنہ کہتے ہیں، بھیجا تھا، اس میں اور باز دامی میں کوئی فرق نہیں، صرف اُڑنے کے بعد دونوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

(ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۱۵-۱۶)

۲۱ امرداد ۱۰۲۷ کے ذیل میں جہانگیر لکھتا ہے کہ سارس کا ایک جوڑا پانچ سال سے چڑیا کھانے میں رہتا ہے، چھٹے سال مادہ نے انڈے دیئے، مادہ تمام رات انڈے سیتی ہے اور دن میں نر و مادہ باری باری سے انڈے پر بیٹھتے ہیں (ج ۲، ص ۳۰) ۲۱ شہریور ۱۰۲۷ کو سارس کے ایک انڈے سے ایک بچہ اور دو روز بعد دوسرے انڈے سے دوسرا بچہ نکلا، ان کی ماں ان کو چگاتی ہے، جہانگیر نے حکم دیا کہ ان بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ (ترجمہ، ج ۲، ص ۴۰-۴۱)

آبان ۱۰۲۸ میں شاہ ایران کا بھیجا ہوا عقاب پہنچا، میر شکار کی غفلت سے بلی اس پر جھپٹی، وہ زخمی ہوا اور ایک ہفتے بعد مرگیا، وہ خوبصورتی اور خوش رنگی میں بے مثل تھا۔ منصور نقاش کو جو نادر العصر کے خطاب سے سرفراز ہے، حکم دیا کہ اس عقاب کی تصویر کھینچ کر محفوظ کرے (ترجمہ، ج ۲، ص ۱۳۶)

خلفائ بنی عباس کے زمانے میں بغدادی کبوتروں کو خط لے جانے کی تربیت کی جاتی تھی، جہانگیر کے حکم سے جنگلی کبوتروں کو خط لے جانے کی تربیت کی جانے لگی بعض کبوتر ایک پہر میں منڈو سے برہان پور پہنچ جاتے تھے۔

(ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۵۹۵-۵۹۶)

---

[1] توزک میں دہ بندی ہے، اور حاشیہ میں دہ بند کو ترکستان کا مشہور قصبہ بیورخ، ج ۲، ص ۱۰ کے حوالے سے بتایا ہے لیکن اس مقام کا نام دہ بید ہے، اور کتاب "ممالک و مسالک" کے حوالے سے دیہ بید (دہ بید) کو فارس میں بتایا گیا۔ (ترجمہ فارسی، ص ۱۱۶)

۱۶ فروردین ۱۰۲۰ کے ذیل میں ہے کہ جہانگیر کے حکم کے بموجب مقرب خاں نے جو کھنبایت کی بندرگاہ سے وابستہ تھا گوا سے عمدہ اور نفیس تحفے بادشاہ کے لیے خریدے تھے، ان میں بعض حیوانات تھے جن کی تصویریں تیار کرا کے جہانگیر نامے میں شامل کی گئیں، ان میں ایک جانور جثے میں مور کی مادہ سے کچھ بڑا تھا، جب وہ مست ہوتا تھا تو مور کی طرح ناچتا تھا، ایک دوسرا جانور لنگور کی طرح تھا، لیکن اس کی آنکھیں باز کی آنکھوں سے ملتی جلتی ہیں، اس کی لمبائی ایک گز ہے، بادشاہ نے جنگلی مرغیوں سے انڈے اور بچے نکلوائے، اکبر اس طرح کی کوشش میں ناکام رہا تھا۔ (ترجمہ، ج ۱، ص ۳۵۹-۳۶۰)

تلواڑہ کے زمیندار راسو نے ایک پرندہ جہانگیر کو پیش کیا جس کو پنجاب کے لوگ جان بہن کہتے ہیں، یہ پرندہ تیتر کے مانند ہے جسے تدرو بھی کہتے ہیں، جان بہن کا گوشت تیتر کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ (ترجمہ، ج ۲، ص ۲۹۸)

اس علاقے میں ایک پرندہ ہے جس کو پھول بکار کہتے ہیں اور اہلِ کشمیر اس کو سوتلو کے نام سے پکارتے ہیں، مورنی کے نصف سے کچھ کم ہوتا ہے، اس کی پشت، دم اور دونوں بازوؤں کی رنگت چکوے کے بازوؤں کی طرح سیاہی مائل ہوتی ہے، اس خطے میں مرغ زرّیں بھی ملتا ہے اسے اہل لاہور "شن" اور اہل کشمیر "بوط" کہتے ہیں، رنگ مور کے سینے کے رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے سر پر کلغی ہوتی ہے، جثے میں قاز کی طرح ہے۔

(ترجمہ اردو، ج ۲، ص ۲۹۹)

جہانگیر نے سن رکھا تھا کہ ہما چڑیا پیر پنجال کے پہاڑ میں ملتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس کی غذا ہڈیوں کے ریزے ہیں، یہ چڑیا ہمیشہ فضا میں اُڑا کرتی ہے، چونکہ بادشاہ کی طبیعت اس طرح کے واقعات کی تحقیق کی طرف مائل ہے حکم ہوا کہ جو شخص اس کو لائے گا اس کو ہزار روپے انعام ملیں گے جمال خاں قراول نے ایک چڑیا ماری وہ زندہ رہ گئی بادشاہ کی خدمت میں لائی گئی، اس کا پوٹا چاک کیا گیا تو اس میں سے ہڈیوں کے ریزے نکلے، کہتے ہیں ہما کی نظر ہڈی پر رہتی ہے وہ زمین پر سے اُسے اٹھا لیتی ہے اور بہت اُوپر

سے چٹان پر پھینک کر اسے ریزہ ریزہ کرتی اور پھر اٹھا کے کھا لیتی ہے، اس کے بارے میں کہا گیا ہے:

ہمائے بر ہمہ مرغان ازاں شرف دارد
کہ استخوان خورد و طایرے نیازارد

(ترجمہ، ج ۲، ص ۴۶۰ - ۴۶۱)

کشمیر میں یہ پرندے ہوتے ہیں:

کلنگ، سارس، مور، چرز، لک لک، تغدری، تغداغ، بگلا، زرد تلک، نقرہ پا چرم، لیلورہ، حواصل، مکشہ، تقلہ، قاز، کونکلہ، تیتر، شارک، تونسرج، موسیچہ، ہریل، دھنک، کویل، شکر خوارہ، مہوکا، مہولات، ہنس، کلچڑی، ٹیٹری جس کا نام جہانگیر نے بدآواز رکھا تھا۔

توزک میں پھولوں پھلوں کا کثرت سے بیان ہے اور اس بیان سے جہانگیر کی ندرتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے، صرف چند جگہ سے کچھ مثالیں لے لی جاتی ہیں۔

آگرہ اور اس کے اطراف میں خربوزہ، آم اور دوسرے میوے کثرت سے ہوتے ہیں، پھلوں میں آم سے جہانگیر کو زیادہ رغبت تھی، اکبر کے زمانے میں جو میوے ہندوستان میں نہیں ہوتے ان کے پودے ولایت سے منگوا کر لگائے گئے۔ انگور کے مختلف اقسام صاحبی، حبشی، کشمشی مختلف شہروں میں بھیجے گئے۔ اس وقت لاہور کے بازاروں میں ہر قسم کا انگور وافر مقدار میں ملتا ہے، یہاں کے میووں میں ایک میوہ انناس ہے جو نہایت خوشبودار اور خوش مزہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے پھولوں کو ان کی خوشبو کی وجہ سے دنیا کے تمام پھولوں پر ترجیح دی جا سکتی ہے، چند پھول تو ایسے ہیں کہ دنیا میں ان کی مثال نہیں۔ چنپا کا پھول بڑا خوشبودار ہوتا ہے۔ وہ گل زعفران کی طرح ہوتا ہے، اس کا رنگ زرد مگر سفیدی مائل ہوتا ہے، پھولوں کے موسم میں اس کا ایک درخت تمام باغ کو معطر کر دیتا ہے، اس کے بعد گل کیوڑہ ہے جو اپنی خوش اندامی اور خوبصورتی میں کوئی نظیر نہیں رکھتا، اس کی خوشبو تندی اور تیزی میں مشک سے کم نہیں، اس کے بعد رائے بیل

ہے جو خوشبو میں سفید چنبیلی جیسی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ اس کے پتے دو تین تہوں میں ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں، پھر مولسری ہے اس کا درخت خوش اندام، موزوں اور بڑا سایہ دار ہوتا ہے، اس کے بعد گل سیوتی ہے جو کیوڑے کی ایک قسم ہے فرق اتنا ہے کہ کیوڑے میں کانٹے اور گل سیوتی بغیر کانٹے کی ہوتی ہے، درختوں میں سرو، صنوبر، چنار، سفید آڑو اور بید مولہ ولایت سے منگا کر یہاں لگائے گئے، وہ بڑی کثرت سے ہوئے، صندل کا درخت جو فقط جزیروں میں پیدا ہوتا ہے، یہاں کے باغوں میں خوب پھلا پھولا۔ (ترجمہ، ج ا، ص ۵۶ ببعد)

کشمیر کا تمام زعفران پانپور میں جو سری نگر سے دو کوس کے فاصلے پر ہے حاصل ہوتا ہے، دنیا کے کسی مقام پر زعفران اتنی مقدار میں پیدا نہیں ہوتا، ہر سال ہندوستان کے وزن کے مطابق پانسو من جو ولایت کے تول کے مطابق چار ہزار من ہوتا ہے یہاں سے زعفران حاصل ہوتا ہے، جہانگیر اپنے والد اکبر کے ساتھ زعفران کے پھولنے کے موسم میں اس سرزمین میں گیا تھا، دنیا کے تمام پھول پہلے شاخ، پھر پتے اور پھول لاتے ہیں اس کے برخلاف خشک زمین میں چار انگل برابر زعفران کا تنہ نکلتا ہے، پھر اس پر سوسنی رنگ کا پھول جس پر چار پنکھڑیاں ہوتی ہیں، کھلتا ہے، اس کے درمیان گل معصفر کی طرح چار نارنجی رنگ کے ریشے ہوتے ہیں جو انگلی کے پور کے برابر ہوتے ہیں، یہی پھول ہے جو ڈھیلوں کے درمیان بغیر جوتی اور بغیر سینچی ہوئی زمین میں اگتا ہے، جو لوگ ان کے قریب تھے، خوشبو سے ان کے سر میں درد ہو گیا، جہانگیر کے بھی سر میں درد ہو گیا، کشمیری پھول توڑنے والوں کے سر میں کبھی درد نہیں ہوتا۔ (ترجمہ، ج ا، ص ۱۹۲)

زعفران کے متعلق یہ بات سنی جاتی ہے بلکہ بعض طب کی کتابوں مثلاً ذخیرۂ[1] خوارزم شاہی میں لکھا ہے کہ زعفران کھانے سے ہنسی آتی ہے اور زیادہ کھانے سے ہنستے ہنستے ہلاکت

---

[1] فارسی میں طب کی بڑی اہم تصنیف ہے، اس کا مصنف اسماعیل جرجانی ہے اور اس نے یہ کتاب قطب الدین محمد بن انوشتگین خوارزمشاہ ۵۰۴ ہجری میں لکھی تھی۔

کا اندیشہ رہتا ہے، جہانگیر نے ایک واجب القتل مجرم کو پاؤ بھر زعفران کھلایا لیکن اس کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا، دوسرے دن اس سے دگنا کھلایا لیکن ہنسنے اور مرنے کا کیا ذکر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نہ پیدا ہوئی۔ (ترجمہ، ج ۲، ص ۴۵۵)

کابل کے میوے میں شاہ آلو ذائقہ دار اور خوش مزہ ہوتا ہے، دوسرے میوؤں کی بہ نسبت یہ زیادہ کھایا جا سکتا ہے جہانگیر نے ایک دن میں ۱۵۰ دانے کھائے، شاہ آلو سے مراد گیلاس ہے، اکبر نے اس کا نام شاہ آلو رکھا تھا، پیوندی خوبانی بھی یہاں کثرت سے ہوتی ہے، یہاں کے آڑو نفیس اور بڑے ہوتے ہیں، استالف سے آڑو آئے، ایک آڑو چالیس روپے کے برابر ٹھہرا، اگرچہ کابل کے میوے بہت ذائقہ دار ہوتے ہیں لیکن جہانگیر کے نزدیک کوئی میوہ آم کی برابری نہیں کر سکتا۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۱۴)

---

۲۱ – آذر ۱۰۲۸ میں پرگنہ کیرانہ میں، جو مقرب[1] خاں کا وطن ہے، قیام ہوا، مقرب خاں نے یہاں باغات لگوائے ہیں، ان کی بڑی تعریف ملتی ہے، یہ شاندار اور دلکش باغ ہے جو ۱۴۰ بیگھے میں ہے اس میں دنیا جہاں کے درخت لگے ہیں، پستے کے بھی درخت ہیں اور باغ کے سرو ایسے ہیں جیسے جہانگیر نے پہلے نہیں دیکھے تھے (ترجمہ، ج ۲، ص ۱۴۰ - ۱۴۱)

کشمیر بادشاہوں کے لیے عشرت فزا گلشن اور درویشوں کے لیے دلکشا خلوت گاہ ہے، اس کے خوشنما چمن اور دلکشا آبشار شرح و بیان سے باہر ہیں، آب رواں اور چشمے حد و شمار

---

[1] مقرب خاں کا نام شیخ حسن تھا، وہ اکبر کے شاہی طبیبوں کے زمرے میں بحیثیت جراح داخل ہوا تھا۔ جہانگیر نے اسے پہلے گجرات کا صوبے دار مقرر کیا پھر ۱۰۲۷ میں بہار کا صوبے دار بنایا، آخر میں جہانگیر نے اسے بخشی گری کی خدمت پر مامور کیا۔ شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کے پہلے سال اس کو خدمت سے معاف کر کے کیرانہ جو اس کا وطن تھا اُس کو بطور معافی کے دے دیا، وہیں نوے سال کی عمر میں ۲۰ ذی قعدہ ۱۰۵۶ میں وفات پائی۔ پانی پت میں شاہ بو قلندر کے جوار میں دفن ہوا (ماثر الامرا، ج ۳، ص ۳۷۹ - ۳۸۱) نیز رک توزک ترجمہ، ج ۱، ص ۷۷ بعد)

سے زیادہ ہیں، جہاں تک نظر جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے، موسم بہار میں پہاڑ اور جنگل قسم قسم کے پھولوں سے ڈھک جاتے ہیں، یاسمن کبود کثرت سے ہوتی ہے، یاسمن سفید (چنبیلی) بے حد خوشبودار ہوتا ہے، گلاب کئی قسم کے ہوتے ہیں، گل سوسن دو طرح کا ہوتا ہے، گل جعفری بڑا اور خوشبودار ہوتا ہے، پھلوں میں خوبانی، ناشپاتی، امرود قابلِ ذکر ہیں توت اچھی نہیں ہوتی، تربوز اور خربوزے اچھے ہوتے ہیں، سیب کافی ہوتے ہیں لیکن بعض کھٹے ہوتے ہیں، توت کے پتے ریشم کے کیڑوں کی خوراک ہیں، یہاں چاول موٹا ہوتا ہے، یہاں بھینس نہیں ہوتی، گائے چھوٹی ہوتی ہے، مرغ، قاز، مرغابی کثرت سے ہوتی ہیں، پشمینے کے کپڑے عام ہیں، کشمیری شال تعریف سے مستغنی ہے۔ اکبر بادشاہ نے اس کا نام پرم نرم رکھا تھا، عوام میں صاف کپڑا پہننے کا رواج نہیں، ایک لمبا کرتا جو سر سے پاؤں تک ڈھکا رہتا ہے، عام طور پر پہنا جاتا ہے، اکثر لوگوں کے گھر دریا کے کنارے ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی ان کے بدن کو نہیں لگتا۔

(توزک ترجمہ، ج ۲، ص ۱۹۶ - ۲۰۶)

توزک جہانگیری میں جہانگیر کے شکار کے بیسیوں واقعات درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے اس کو شکار کا جتنا شوق تھا شاید ہی کسی حکمراں کو ہو، اور ان شکاروں کی جتنی تفصیل توزک میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی، جہانگیر نے جتنے شیر شکار کیے کسی ایک شخص نے اتنے شکار نہیں کیے ہوں گے اس سلسلے کی کچھ تفصیل سنتے جایئے۔

پہلے سال جلوس میں تین ماہ چھ روز بادشاہ شکار میں مشغول رہا، اس درمیان ۵۸۱ جانور شکار کیے، ۱۵۸ جانور خود جہانگیر نے بندوق سے شکار کیے، بندوق شکاری چیتوں، جال اور ہانکے کے ذریعے شکار ہوئے، دو مرتبہ ہانکا کرایا، ایک مرتبہ شاہی محل کی خواتین بھی ساتھ تھیں، اس وقت ۱۵۵ جانور شکار ہوئے دوسری مرتبہ ۱۱۰ جانور شکار کیے۔ ۱۶ شوال ۱۰۱۵ کو لاہور واپس ہوئے، اس شکار میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، چنڈالہ گاؤں میں ایک کالے ہرن کے پیٹ پر گولی ماری، زخمی ہرن نے ایک ایسی آواز نکالی کہ ہرن ایسی آواز صرف مستی کی حالت میں نکالتے ہیں، پرانے شکاریوں نے اس کی تصدیق کی۔

شائقینِ شکار سے جہانگیر نے بارہا سنا ہے کہ پہاڑی مینڈھوں کی سینگ کے اندر کیڑے پڑ جاتے ہیں جس سے خارش ہوتی ہے، اسی خارش کی وجہ سے وہ دوسرے مینڈھوں سے لڑنے لگتے ہیں، کبھی کبھی درخت یا پتھر سے اپنی سینگ ٹکرا کر خارش کو تسکین دیتے ہیں، تلاش کے بعد ایک مادہ بھیڑ کی سینگوں میں کیڑے نکلے حالانکہ مادہ بھیڑ نہیں لڑتی، اس سے ظاہر ہوا کہ اس بات کی کوئی حقیقت نہیں۔

(توزک ترجمہ، ج ۱، ص ۱۶۵)

دوسرے سال جلوس ذی قعدہ ۱۰۱۵ میں جہانگیر بلدہ میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہ موضع جہانگیر کی مقرّرہ شکارگاہ ہے، اس کے حوالی میں منسراج نامی ہرن کی قبر ہے اس پر جہانگیر کے حکم سے ایک منار تیار کیا گیا۔ منارہ کے ایک پتھر پر محمد حسین کشمیری کے قلم سے ایک نثری کتبہ درج ہے، یہ قصبہ لاہور سے شمال مغرب میں ۲۴ میل کے فاصلے پر ہے اور اب شیخوپورہ کہلاتا ہے، اس منارہ پر جو ہرن منارہ کے نام سے مشہور ہے، اس پر ایک عالمانہ مقالہ پروفیسر محمد شفیع کے بیٹے احمد ربانی نے لکھا اور ارمغانِ علمی میں شائع کیا ہے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ منسراج ہرن ہرنوں کی لڑائی میں بے مثل تھا، بادشاہ نے اس کی غیر معمولی صفات کی بنا پر حکم دیا کہ کوئی شکاری یہاں ہرنوں کا شکار نہ کرے اور یہاں کے ہرنوں کے گوشت ہندو اور مسلمان پر حرام سمجھے جائیں۔ (توزک ترجمہ، ج ۱، ص ۱۹۰)

کابل سے واپسی پر سرخہ ہرن کے شکار کا شوق غالب ہوا تو جمادی الاوّل ۱۰۱۶ کو ہانکے کے شکار کے لیے روانہ ہوا۔ تقریباً سو ہرن گھیرے میں آئے، ان میں سے پچاس ہرن شکار ہوئے۔ ۱۴ رجب ۱۰۱۶ راول پنڈی میں ہانکے کے شکار کا انتظام ہوا، اس میں ۲۴ سرخہ ہرن ۳۵ چکارہ شکار ہوئے۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۲۶)

ذی الحجہ ۱۰۱۶ میں نوروز کے دن راجہ نرسنگھ دیو نے ایک سفید چیتا نذر کیا، جہانگیر نے

---

[1] حصّہ انگریزی، ص ۱۸۱ بعد

اس وقت تک سفید چیتا نہیں دیکھا تھا، اس کے جسم پر نیلے رنگ کے داغ تھے، اس کی سفیدی نیلگوں تھی، جہانگیر کہتا ہے کہ طویلہ (سفید جنس) کے جانوروں میں شاہین، باشہ، شکرہ، چکور، تیتر، بودنہ، مور دیکھے ہیں، چڑیا گھر میں اکثر سفید رنگ کا باز ہوتا ہے، سفید گلہری بھی دیکھی گئی ہے، چکارہ ہرنوں کی قسموں میں سفید چکارے بھی نظر سے گذرے ہیں۔

(ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۵۲)

جہانگیر کے ابتدائے شکار سے شہر میں داخل ہونے تک ۵۶ دن ہوئے اس مدت میں ۱۴۶۲ جانور شکار ہوئے، ستر نیل گائیں، ستر سیاہ ہرن، ۵۱ ہرنیاں، پہاڑی بکرے ۸۱، کلنگ، مور، سرخاب وغیرہ پرندے ۱۲۹، اور ایک ہزار تیئس مچھلیاں۔

(ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۲۹۷)

---

۴ ذی قعدہ ۱۰۱۹ کو جہانگیر مچھلی کے شکار میں مشغول رہا، اور ۷۶۶ مچھلیاں پکڑی گئیں، جہانگیر ہی سوائے فلوس والی مچھلیوں کے اور مچھلی نہیں کھاتا تھا اس لیے نہیں کہ شیعہ حضرات غیر فلوس دار مچھلیوں کو حرام سمجھتے ہیں بلکہ سنا گیا ہے کہ غیر فلوس والی مچھلی مردے کھاتی ہے لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ شیعہ حضرات کس وجہ سے غیر سفنہ والی مچھلی کیوں نہیں کھاتے۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۳۱۷)

---

۱۰ ذی الحجہ ۱۰۱۹ کو عید قربان تھی، وہ جمعرات کا دن تھا، جہانگیر کے حکم کے مطابق جمعرات کو جانور ذبح کرنا منع ہے، چنانچہ دوسرے دن یعنی جمعہ کو قربانی ہوئی، جہانگیر نے تین بکریاں اپنے ہاتھ سے ذبح کیں اور شکار کے لیے روانہ ہوگیا، وہ ایک منزل پر پہنچا جہاں دو سال پہلے وہ شکار کے لیے گیا تھا۔ اس وقت ایک نیل گائے پر دو بار گولی چلائی لیکن بچ گئی، اس مرتبہ وہی نیل گائے سامنے آگئی، قراولوں نے پہچان لیا۔ جہانگیر نے گولی چلائی مگر وار خالی گیا۔ آخر میں نے منت مانگی کہ اگر یہ نیل گائے اس کے ہاتھ لگ جائے تو اس کا گوشت پکوا کر حضرت معین الدین چشتی کی روح کے ایصال ثواب کے محتاجوں کو کھلایا جائے گا، اس منت کے مانتے ہی نیل گائے ٹھہر گئی، اس کو پکڑ کر ذبح کیا گیا

اور اکبر بادشاہ کی نذر ایک اشرفی میں سے ایک روپیہ کا حلوا پکوا کر جہانگیر نے اپنے سامنے فقرا میں تقسیم کیا، دو تین روز بعد جہانگیر پھر شکار کو نکلا، ایک نیل گائے نظر آئی، ہر چند کوشش کی گئی کوئی نیل گائے ہاتھ نہ لگی۔ آخر کار بادشاہ کے منہ سے نکلا "خواجہ یہ بھی آپ کی نذر ہے"، یہ کلمہ زبان سے نکلنا تھا کہ نیل گائے بیٹھ گئی، اس کو شکار کیا گیا اور اس کا گوشت حسب دستور فقرا میں تقسیم ہو گیا۔ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۳۱۸ - ۳۱۹)

مانڈو کے سفر میں ۱۰۲۶ میں میرزا رستم نے ایک بھیڑیا شکار کیا، جہانگیر کو خیال ہوا کہ اس کا پتّا دیکھنا چاہیے آیا شیر کی طرح اس کا پتّا بھی جگر کے اندر ہوتا ہے یا اور جانوروں کی طرح جگر کے باہر، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا پتّا بھی جگر کے اندر ہوتا ہے۔
(ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۵۶۲)

۱۰۲۶ میں ایک دیوانے کتّے نے پہلے ایک ہتھنی کو پھر شاہی ہاتھی کو کاٹ لیا، اس واقعے کے ایک ماہ پانچ دن بعد آسمان پر بادل چھایا، بجلی کڑکی، اس کے اثر سے ہتھنی کے جسم پر لرزہ پیدا ہوا، وہ آٹھویں دن مر گئی، اس کے ایک ماہ بعد شاہی ہاتھی پر وہی کیفیت طاری ہوئی اور وہ بھی مر گیا، جہانگیر کو حیرت تھی کہ اتنے قوی ہیکل جانور اتنے چھوٹے کتّے کے معمولی زخم سے اتنی دردناک موت کا شکار ہو جائیں۔ جہانگیر کے زمانے میں Rabies کے بارے میں معلومات نہ تھیں۔

جہانگیر نے بارہ سال کی عمر سے ۵۰ سال کی عمر تک کے شکار کے اعداد و شمار جمع کر دیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے واقعہ نویسوں، مشرفوں، قراولوں اور دوسرے شاہی خدام اور عملے کے ذریعے ہر قسم کے شکار شدہ جانوروں کی الگ الگ فہرستیں تیار کرائیں، ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ بارہ سال کی عمر سے یعنی ۹۸۸ھ ۱۰۲۵ تک جو اس کی تخت نشینی کا گیارھواں سال ہے، اور اس کی عمر کا قمری حساب سے پچاسواں سال ہے۔ ۲۸۵۳۲ جانور اس کے حضور میں شکار کیے گئے، اس میں سے ۱۷۱۶۷ بندوق سے شکار کیے گئے، چرندے جانور ۳۲۰۳، شیر: ۸۶؛ ریچھ، چیتے، لومڑیاں، اود بلاؤ اور بجو: ۹

نیل گائیں ۸۸۹، مہاکہ: ۹، راس جو (بارہ سنگھے کی قسم) ہرن، چکارے، چیتل، پہاڑی بکرے وغیرہ ۱۶۷۰، مینڈھے، صرفہ ہرن ۲۱۵، بھیڑیے: ۶۴، جنگلی بھینسے ۳۶، سور: ۹۰، پہاڑی ہرن ۲۶، پہاڑی مینڈھے: ۱۲ اور ارغلی: ۳۲، گورخر ۶: خرگوش ۲۳، آبی جانوروں میں مچھلیوں کے علاوہ مگرمچھ دس عدد شکار کیے ہوئے پرندوں کی تعداد ۱۰۳۴۸ ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

کبوتر کئی ہزار، لکرھ جکڑ: تین، عقاب: دو، چیلیں: ۲۳، چغد ۲۹، بڑی قوطان ۱۲، موش مور: ۵، فاختہ پچیس، الو: ۳۰، مرغابی، قاز، بگلے: ۱۵۰، کوے: ۳۲۷۶ وغیرہ (ترجمہ توزک، ج ۱، ص ۵۶۷ - ۵۶۸)

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے چند اہم نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ فہرست نامکمل ہے، جہانگیر اس کے بعد کئی سال اور زندہ رہا ہے، اس نے نہ جانے اس مدت میں کتنا اور شکار کیا ہوگا۔

۲۔ اس فہرست سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شاید ہی دنیا میں ایسا کوئی دوسرا حکمراں ہو، جس نے شکار میں ایسی دلچسپی دکھائی ہو۔

۳۔ جہانگیر کے شیر کے شکار کی تعداد ۸۶ ہے جو یقیناً سو سے بڑھ گئی ہوگی، ہمارے علم کے مطابق جم کاربٹ دنیا کے شیر شکاروں میں نہایت اہمیت رکھتا تھا، سنا ہے کہ اس نے ۳۰ شیر شکار کیے تھے، ضرورت ہے کہ اس بات کا اعلان ہو کہ دنیا کا سب سے بڑا شیر کا شکاری جہانگیر بادشاہ ہے۔

۴۔ اعداد و شمار کی یہ فہرست اس دورِ جدید میں (کمپیوٹر کے رواج سے قبل) ناممکن ہے، جہانگیر کے عہد میں ایسی فہرست کی تیاری اس عہد کی ضابطگی پر دلالت کرتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ابوالفضل کے اعداد و شمار کی جو فہرست آئینِ اکبری میں ملتی ہے اس پر غور کیا جائے تو مغل حکومت کے مضبوط نظام کا بخوبی پتا چلتا ہے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ میری طبیعت شیر کے شکار کی طرف اتنی راغب ہے کہ جب تک مجھے شیر کا شکار میسر ہوتا ہے میں کوئی دوسرا شکار نہیں کھیلتا، سلطان محمود غزنوی کا بیٹا سلطان مسعود بھی شیر کے شکار کا بہت شائق تھا، اس کے شکار کھیلنے کے بہت سے

عجیب وغریب واقعات خصوصاً تاریخ بیہقی[1] میں مذکور ہیں۔ اس تاریخ کے مصنف نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے بطور روزنامچے کے لکھ دیا ہے، اس میں یہ واقعہ بھی نقل ہے کہ ایک روز سلطان مسعود[2] ہندوستان کے کسی علاقے میں ہاتھی پر سوار ہوکر شیر کے شکار کے لیے نکلا، اس کے سامنے ایک بڑا شیر جنگل سے نکلا اور ہاتھی کی طرف لپکا، سلطان نے شیر کے سینے پر برچھی ماری، شیر نے غضبناک ہوکر جست لگائی اور ہاتھی کی پشت پر آگیا، سلطان مسعود نے دوزانو ہوکر شیر پر تلوار سے ایسا وار کیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور وہ نیچے گر کر مر گیا۔ (ترجمہ توزک، ج ۲، ص ۲۷۱)

جہانگیر آگے لکھتا ہے کہ جیسا اتفاق سلطان مسعود کو ایام شاہزادگی میں ہوا تھا ویسا ہی اُسے بھی شہزادگی کے زمانے میں ہوا تھا، وہ شکار کو گیا ہوا تھا ایک قوی ہیکل شیر جنگل سے برآمد ہوا، جہانگیر نے ہاتھی پر سے بندوق چلائی، شیر نے غضبناک ہوکر چھلانگ لگائی، شاہزادے نے بندوق کی دونوں نالی ہاتھ میں پکڑ کر اس کا کندہ اتنے زور سے شیر کے سر پر مارا کہ شیر زمین پر گر پڑا اور وہیں ڈھیر ہوگیا، ایک بھیڑیا سامنے آیا، اس پر ایک

---

[1] تاریخ بیہقی چاپ دکتر غنی و دکتر فیاض، ص ۱۲۵ پر مسعود کی ورزش وزور آزمائی کا تذکرہ ہے، پھر اس کے اکیلے شکار کھیلنے کا ذکر ہے، آگے مولتان (ہند) میں بخار کی حالت میں شیر کے شکار کی داستان ہے۔ شیر بہت بڑا اور بہت قوی تھا، سلطان نے باوجود ضعف کے شیر کو تنہا اس طرح زیر کیا کہ سارے ساتھی حیران رہ گئے۔

جب امیر بڑا ہوگیا تو ہاتھی پر بیٹھ کر شکار کرنے لگا، ایسا ہی ایک شکار جو حدود ہندوستان میں کیا گیا۔ تاریخ بیہقی میں نقل ہے۔

[2] بیہقی میں یہ واقعہ اس طرح نقل ہے، پس از آن امیر چنان کلان شد کہ ہمہ شکار بر پشت پیل کردی، دیدم وقتی در حدود ہندوستان کہ از پشت پیل شکار میکردی و روی پیل را از آہن پوشیدہ بودند چنانکہ رسم است، شیری سخت از بیشہ بیرون آمد و روی بہ پیل نہاد امیر خشتی بینداخت و بر سینۂ شیر زد چنانکہ جراحتی قوی کرد، شیر از درد و خشم یک جست کرد چنانکہ بقفای پیل آمد و پیل می طپید، امیر بزانو درآمد و یک شمشیر زد چنانکہ ہر دو دست شیر قلم کرد، شیر بزانو افتاد و جان بداد، و ہمگنان کہ حاضر بودند اقرار کردند کہ در عمر خویش از کسی این یاد ندارند۔

تیر مارا جو اس کے جسم میں گھس گیا اور بھیڑیے نے دم توڑ دیا، اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ قوی تیر اندازوں نے بھیڑیے پر بیس سے تیس تیر چلائے مگر بھیڑیا نہیں مرا۔

(ترجمہ تزک، ج ۲، ص ۲۷۲)

غور کرنے کا مقام ہے کہ شیر شاہ سوری کے ایک شیر کے مارنے کی روایت اتنی مشہور ہے، اور اس کے برخلاف جہانگیر کے پچاسوں شیر کے مارنے کے واقعے کو کوئی نہیں جانتا حتیٰ محمد حسین آزاد جیسے محقق نے اپنی کتاب دربار اکبری میں جہانگیر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ایک بازاری شراب خور سے بڑھ کر نہیں جو شراب پی کر نالی میں پڑا رہتا ہے۔ حالی کا یہ شعر جہانگیر پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

ایسے ہوتے کہاں ہیں مست و خراب　　ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

اب میں تزک جہانگیری کے چند عام دلچسپی کے واقعات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ مریدوں کو نصیحت کرتے وقت چند کلمے بطور نصیحت کے کہتا ہوں، کسی قوم و ملت کی مخالفت میں اپنا وقت ضائع نہ کریں، تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ صلح کل کا برتاؤ کریں، کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے نہ ماریں، تمام سیّارے انوارِ الٰہی کے مظہر ہیں، ہر ایک کی تعظیم اس کے درجے کے اعتبار سے کرنی چاہیے، ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی کو موجدِ حقیقی اور کارساز جاننا چاہیے بلکہ تفکر کرنا چاہیے تاکہ خلوت و جلوت میں کوئی لمحہ دل اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔

کابل کے قریب جنوب میں پتھر کا چبوترہ بنایا گیا ہے، اس پر بیٹھ کر بابر بادشاہ شراب پیتا تھا، اس کے برابر پتھر کاٹ کر ایک حوض بنایا گیا ہے جو شراب سے پُر کی جاتی ہے، چبوترے کی ایک دیوار پر یہ عبارت کندہ ہے:

"تخت گاہ بادشاہ عالم پناہ ظہیر الدین محمد بابر ابن عمر شیخ گورکان خلد اللہ ملکہ فی سنتہ ۹۱۴ھ"

جہانگیر کے حکم سے اس چبوترے کے برابر ایک چبوترہ اور اس کے پہلو میں ایک قدرے چھوٹا حوض شراب سے پُر کرنے کے لیے بنایا جائے، دونوں حوض شراب سے پُر رہیں اور جو اہلِ دربار وہاں جائیں وہ شراب سے لطف اندوز ہوں۔ (ترجمہ، ج ۱، ص ۲۰۶-۲۰۷)

محرم ۱۰۱۹ میں مثنوی یوسف زلیخا کی ایک جلد جو مُلّا میر علی [کاتب] کی آب زر سے لکھی ہوئی ہے اور جس پر طلائی جلد نہایت دیدہ زیب ہے اور جس کی قیمت ایک ہزار اشرفی ہے خان خاناں نے ہدیتاً بھجوائی۔ (ترجمہ، ج ۱، ص ۲۹۸)

دہلی کے قوالوں کی ایک جماعت جہانگیر کے سامنے گا رہی تھی اور امیر خسرو کی یہ بیت برابر دہرائی جا رہی تھی:

ہر قوام راست راہے دینے و قبلہ گاہی
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہی

مُلّا علی احمد مہر کن جس کے والد نے جہانگیر کو بچپن میں کچھ پڑھایا تھا اس نے بیان کیا کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ ایک دن شیخ نظام الدین اولیا جمنا کے کنارے ہندوؤں کی پرستش کا تماشا دیکھ رہے تھے، اس وقت سر ہران کی ٹوپی ترچھی تھی، اتنے میں امیر خسرو آ گئے تو شیخ نے یہ مصرعہ پڑھا:

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہی

امیر خسرو نے فوراً دوسرا مصرعہ لگایا:

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہی

ابھی دوسرا مصرعہ مہر کن کی زبان پر تھا کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور دم توڑ دیا، جہانگیر کہتا ہے کہ ایسی اچانک موت اس نے نہیں دیکھی تھی۔
(ترجمہ، ج ۱، ص ۳۰۰)

---

۲۸ رمضان ۱۰۱۹ کو سورج گرہن ہوا، اس کی نحوست دُور کرنے کے لیے اُسے سونے اور چاندی میں تولا گیا، ایک ہزار آٹھ سو تولہ سونا اور چار ہزار نو سو روپے اس کے وزن کے برابر ہوئے جو فقرا میں تقسیم کیے گئے۔ (ترجمہ، ج ۱، ص ۳۱۲)

ہندو چار ذاتوں میں منقسم ہیں، پہلی ذات برہمن، ان کے چار فرض ہیں: علم حاصل کرنا، آگ کی پوجا کرنا، محتاجوں کو دان دینا اور امیروں سے دان لینا۔ ساون

کا آخری دن ان کے تہوار کا دن ہے، اس دن وہ ندیوں اور تالابوں کے پاس منتر پڑھتے ہیں اور رنگین دھاگوں پر پھونکتے ہیں اس کو راکھی کہتے ہیں۔

دوسرا گروہ چھتریوں کا ہے، ان کے تین آئین ہیں:

علم حاصل کرتے ہیں مگر دوسروں کو سکھاتے نہیں

آگ پوجتے ہیں مگر دوسروں کو اس کی دعوت نہیں دیتے

محتاجوں کو خیرات دیتے ہیں لیکن کسی سے خیرات نہیں لیتے ہیں

ان کے تہوار کا دن دسہرہ ہے، اس دن رامچندر نے اپنے دشمن پر فتح پائی تھی۔

تیسرا گروہ کسانوں، تاجروں اور ساہوکاروں کا ہے، اس گروہ کا تہوار دیوالی ہے، دیوالی کی رات کو بہت چراغاں کرتے ہیں، ایک دوسرے کے یہاں جاتے ہیں اور خوب جُوا کھیلتے ہیں، چوتھا گروہ شودر ہے، یہ سب سے چھوٹی ذات ہے، یہ سب کی خدمت کرتے ہیں اور ان تمام رعایتوں سے محروم ہیں جو اور طبقوں کو حاصل ہیں، ان کے تہوار کی اس رات گلی، کوچوں میں آگ جلائی جاتی ہے، صبح ہوتی ہے تو دن کے ایک پہر تک ایک دوسرے پر راکھ ڈالتے ہیں اور خوب غل غپاڑہ کرتے ہیں، پھر نہا دھو کر باغوں وغیرہ کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ (ج ۱، ص ۴۰۱۔۴۰۲)

---

۱۱ ماہ تیر ۱۰۲۳ کو شاہی فیل خانے کی ہتھنی نے بچہ دیا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ مادہ بچہ ایک سال ۶ ماہ اور نر بچہ ایک سال ۷ ماہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، ہاتھی کا بچہ پاؤں کے بل پیدا ہوتا ہے۔ (ج ۱، ص ۴۲۹)

رجب ۱۰۲۳ میں جہانگیر نے کان چھدوا کر دونوں کانوں میں حلقہ پہن لیا، یہ عمل اس بات کی علامت تھی کہ وہ خواجہ معین الدین چشتی کا ظاہری طور پر بھی مرید ہو گیا، اس کی تقلید میں درباریوں اور ملازموں نے حلقے پہنے۔ (ج ۱، ص ۴۳۰۔۴۳۱)

عطرِ جہانگیری کی ایجاد نور جہاں کی والدہ کی ہے۔ (ج ۱، ص ۴۳۵)

---

۲۵ ماہ دے خرم کے وزن کا دن تھا، اس کا سن ۲۴ سال تھا اور صاحبِ اولاد تھی، اس وقت اس نے شراب نہیں پی تھی، باپ کے اصرار پر اس روز اس نے شراب پی اور جہانگیر نے بوعلی سینا کی یہ رباعی پڑھی:

می دشمن مست و دوست ہشیار است — اندک تریاک و بیش زہر یار است
در بسیارش مضرت اندک نیست — در اندک او منفعت بسیار است

جہانگیر نے ۲۵ سال کی عمر سے شراب پینا شروع کیا تھا، (پھر تفصیل ہے)
(ج ۱، ص ۴۸۹ - ۴۹۲)

۱۰۲۶ میں جہانگیر اوجین میں تھا، یہاں راجا بکرماجیت کی رصدگاہ ہے، منجموں کا کہنا ہے کہ یہاں کے دریا کا پانی سال میں ایک مرتبہ دودھ ہو جاتا ہے، ابوالفضل جب عازمِ دکن تھا تو اس شہر سے ایک یادداشت بھیجی کہ اس شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے گواہی دی کہ چند روز پہلے دریا کا پانی دودھ ہو گیا تھا جہانگیر لکھتا ہے کہ عقل یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ (ج ۱، ص ۵۵۳ - ۵۵۴)

اوجین میں جہانگیر جدروپ نامی سنیاسی سے ملا جو گوشۂ صحرا میں معبودِ حقیقی کی پرستش میں مشغول رہتا ہے، وہ ایک تنگ و تاریک گپھا میں بغیر چٹائی کے بیٹھا رہتا ہے۔ بادشاہ چھ گھنٹہ اس کے پاس بیٹھا رہا اور اس کی عارفانہ گفتگو سے بہت متاثر ہوا، اکبر بھی اس سے مل چکا تھا (ج ۱، ص ۵۵۴ - ۵۵۷)، جہانگیر اس سنیاسی سے دوبارہ ۱۰۲۷ میں ملا، پھر تیسری بار ملاقات کی، اس کی عمر ۶۰ سال سے زیادہ ہے اور ۳۸ سال سے ریاضت و عبادت میں مشغول تھا۔ (ص ۶۰ - ۶۱)
برہمنوں کی زندگی کی وضاحت کرتے ہوئے جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ خواہشاتِ نفس کی راہوں کو اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں اور ذات الٰہی کی پرستش میں محو رہتے ہیں اور سوائے ویدانت کے کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کرتے۔ بابا فغانی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

یک چراغیست درین خانہ کہ از پرتو آن
ہر طرف می نگرم انجمنی ساختہ اند (ج ۱، ص ۵۵۷)

اسفندماہ ۱۰۲۶ میں پرگنہ دولت آباد کے نزدیک موضع شیخورہ پورہ میں ایک عظیم الشان بڑ کا درخت دیکھا، اس کے تنے کا گھیر ۱۸ گز، بلندی جڑ سے اونچی شاخ تک ایک سو سوا اڑتالیس گز، چنائیں دو سو ساڑھے تین گز، اکبر بادشاہ بھی یہاں سے گزرا تھا، اور شاخ پر پونے چار گز کی بلندی پر اپنا پنجہ کندہ کرایا تھا، جہانگیر نے دوسری شاخ پر آٹھ گز کی بلندی پر اپنا پنجہ منقوش کرایا، پھر دونوں نشانیوں کو اس خیال سے مٹ نہ جائیں سنگِ مرمر پر کندہ کرا کے درخت پر نصب کر دیے، اور درخت کے اردگرد چبوترہ بنا دیا (یہ سب نشانیاں ختم ہو چکی ہوں گی رہے نام اللہ کا) (ج ۱، ص ۵۵۹)

---

۲۳ اسفندار ۱۰۲۶ کو جہانگیر مانڈو کے قلعے میں داخل ہوا، قلعہ پہاڑ پر ہے، یہاں کی لطافت کا مقابلہ کوئی دوسری جگہ نہیں کر سکتی، موسم گرما میں یہاں لحاف کی سردی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں راجا بکرماجیت کے زمانے میں جے سنگھ دیو نامی ایک راجا تھا، اس کے زمانے میں ایک لوہار کو سنگِ پارس مل گیا، لوہار نے یہ پارس راجا کو دے دیا، راجا نے بہت سا سونا اکٹھا کر لیا اور کافی سونا قلعے کی دیواروں میں چنوا دیا، جہانگیر اس کو من گھڑت کہانی قرار دیتا ہے۔ (ج ۱، ص ۵۶۴)

مانڈو کے مقبروں میں سلطان ناصر الدین کی قبر ہے، یہ غیاث الدین کا بیٹا تھا، بڑا ظالم فرمانروا تھا، اس نے اپنے باپ کو زہر دلا دیا تھا، کہتے ہیں شیر خان افغان نے اس کے افعال شنیع کی وجہ سے اس کی قبر پر ڈنڈے برسوائے تھے، ۱۰۲۶ میں جہانگیر وہاں پہنچا تو اس نے پہلے اس کی قبر پر ٹھوکریں ماریں، پھر قبر کھدوائی اور اس کی سڑی گلی ہڈیوں کو آگ لگوانے کا ارادہ کیا، پھر خیال آیا کہ آگ انوارِ الٰہی میں ہے اس کے کثیف جسم کے جلانے سے وہ جوہرِ لطیف مکدر ہو جائے گا، بالآخر وہ پانی میں بہا دی گئیں، یہ واقعہ سلطان کی وفات کے ایک سو دس سال بعد وقوع پذیر ہوا۔

(ج ۱، ص ۵۶۵ - ۵۶۶)

جہانگیر نے اپنے ۱۲ویں سال جلوس میں تمباکو کے استعمال کی ممانعت کرا دی، اس کا

سفیر خان عالم جو ایران کی سفارت پر بھیجا گیا، کثرت سے تمباکو استعمال کرتا تھا، اس پر شاہ عباس نے اس کو لکھا:

رسول یار می خواہد کند اظہار تنباکو　　من از شمع وفا روشن کنم بازار تنباکو

خان عالم نے جواب میں لکھا:

من بیچارہ عاجز بودم از اظہار تنباکو　　ز لطف شاہ عادل گرم شد بازار تنباکو

(ج ۱، ص ۵۷۸)

اطلاعاً عرض ہے کہ اسد بیگ قزوینی نے جو ابوالفضل کا ملازم تھا، اس کے توسط سے ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اواخر عہدِ اکبری میں تنباکو تحفاً بھیجا تھا، اس کا تفصیلی ذکر اسد بیگ کے رسالہ واقعاتِ اسد بیگ میں موجود ہے، دیکھیے راقم کا مضمون مشمولہ معارف جلد ۵۷، شمارہ ۳۔

جہانگیر کے ملبوسات یہ تھے۔

دگلۂ نادری جو قبا کے اوپر پہنا جاتا تھا، اس میں آستین نہیں ہوتی تھی

حاشیہ دار قبا جس کے گریبان اور آستین وغیرہ میں زربفت کے بیل بوٹے ہوتے عوام کو ان کے پہننے کی اجازت نہ تھی۔ (ج ۱، ص ۵۹۲)

جمعرات کو جہانگیر نے مبارک شنبہ نام دیا تھا، یہ دن بہت مبارک تھا، اس لیے کہ اسی دن اس کی تاجپوشی ہوئی تھی، چہارشنبہ کا دن منحوس تھا، اس کا نام اس نے کم شنبہ رکھا۔ (ج ۱، ص ۵۹۴، ص ۵۲۲)

بہار سے جہانگیر کے لیے سون کیلے آئے، یہ نہایت خوش ذائقہ ہوتا ہے، اس کی لمبائی ایک انگلی کے برابر ہوتی ہے، کیلا کھانے کی چیز ہے، البتہ سون کیلا مل جائے تو کھا لینا چاہیے۔ (ج ۱، ص ۶۰۷)

دھار میں دلاور خاں نے ایک مسجد بنوائی تھی، اس کے پیش طاق میں ایک قصیدہ کندہ ہے جس کے تین شعر جہانگیر نے نقل کیے ہیں۔ (ج ۱، ص ۶۱۹ - ۶۲۰)

جہانگیر نے احمد آباد جاتے ہوئے شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ پڑھی، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے، جہانگیر نے ان کے مزار کے سجادہ نشین سیّد محمد سے اس بات کی تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے لیکن حقیقتِ حال تو خدا ہی کو معلوم ہے۔ (ج ۱، ص ۴۳۷)

چونکہ گذشتہ بارہ سال کے حالات مختلف بیاضوں میں تحریر کیے گئے تھے لہٰذا میں نے حکم دیا کہ ان کی ایک جلد بنا کر اس کے متعدد نسخے مرتب کیے جائیں تاکہ میں انھیں خاص خاص امرا کو عنایت کروں اور تمام شہروں میں بھیجے جائیں کہ ارباب دوست اور اصحابِ سعادت اس کتاب کو اپنا دستور العمل بنائیں۔

۸ ماہ شہریور ۱۰۲۷ کو جمعہ کے دن ایک واقعہ نویس نے ان پورے سال کے حالات کو یک جا مجلد کر کے میرے ملاحظے میں پیش کیا، چونکہ یہ پہلا نسخہ تھا میں نے یہ نسخہ فرزند شاہجہان کو عنایت کیا[1]۔ شاہ جہاں کو ہر بات میں اپنے تمام بیٹوں میں مقدم رکھتا ہوں، کتاب کی پشت پر اپنے قلم سے میں نے لکھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر یہ کتاب اس فرزند کو عنایت کی گئی، امید ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب کے سمجھنے کی توفیق حاصل کر کے خوش نصیبی سے بہرہ ور ہوگا جو خالق کی خوشنودی اور مخلوقِ خدا کی دعا گوئی کا باعث ہیں۔ (ترجمہ، ج ۲، ص ۳۳ - ۳۴)

ملتان کے مشہور گردیزی خاندان کے ایک معزز رکن سیّد رمضان علی شاہ گردیزی کی لائبریری میں توزک جہانگیری کا وہی نسخہ موجود ہے جو جہانگیر نے شاہزادہ خرّم کو عطا کیا تھا، کتاب کے بیرونی صفحے پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب وہی ہے جو جہانگیر نے شاہزادہ خرّم کو عطا کی

---

[1] ترجمہ ج ۲، ص ۴۶: اسی عرصے میں جہانگیر نامے کی دو جلدیں مرتب ہو کر میری نظر سے گزریں، ان میں سے ایک جلد چند روز پیشتر میں نے مدار الملک اعتماد الدّولہ کو عنایت کر دی تھی اور آج کی تاریخ میں (۴ مہر ۱۰۲۷) دوسری جلد فرزند آصف خان کو عنایت کی۔

تھی، کتاب کے بہت سے مقامات بے احتیاطی کے باعث کٹ گئے ہیں، کچھ اوراق مرمت میں خراب ہو گئے ہیں... جہانگیر کی اپنی یہ تحریر ہے:

الله اکبر

بعد از جلوس ہمایوں بخاطر رسید کے واقعات زمان دولت ابد پیوند بہ دستوری کہ حضرت فردوس مکانی بزبان ترکی در قید آوردہ واقعات بابری نام نہادہ' بزبان فارسی کہ عام فہم باشد در... آرم، چون دوازدہ سالہ احوالش بہ بیاض رفتہ بود در روز مبارک ہفت شہریور سنہ ۱۲ جلوس مطابق ہشتم رمضان ۱۰۲۷ درین روز .... از احمد آباد گجرات توجہ دار الخلافہ آگرہ بود، این نسخۂ شریف بفرزند سعادتمند... ودحۂ شجرۂ وجود... مخصوص بعنایت فلک مکان۔

حاشیہ کے ایک جانب شاہ جہاں کی یہ تحریر ہے:

این دفتر اوّل جہانگیر نامہ را پدر بزرگوار بمن عنایت فرمودند حررّہ شاہ جہان

جہانگیر نے احمد آباد کو گرد آباد کہا (ج ۱، ص ۴۲۸) اس کے بعد سموستان، بیمارستان، زقومستان یا جہنم آباد کہا۔ (ج ۱، ص ۱۸)

شہریور ۱۰۲۷ کو شاہ عالم کے پوتے سید محمد کو قرآن مجید کا ایک نادرِ روزگار نسخہ جو یاقوت کاتب (مستعصمی) کے ہاتھ کا تھا، عنایت کیا۔ (ج ۲، ص ۴۳)

جہانگیر لکھتا ہے کہ ایک بار اکبر نے شیخ سلیم چشتی سے ان کی عمر اور اس دنیا سے رخصت ہونے کا دن پوچھا، شیخ نے جواب دیا کہ غیب کا حال خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے' پھر مراقبے میں گئے اور اس کے بعد جہانگیر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ جب یہ شہزادہ تعلیم شروع کرے گا، شیخ سلیم کے اس ارشاد کے بعد اکبر نے حکم دیا کہ کوئی شخص شہزادے کو نظم یا نثر کی کوئی چیز نہ پڑھائے گا، ایک دن ایک غریب عورت شہزادے کے پاس آئی اور وہ شاہی حکم سے بے خبر تھی، اس نے شہزادے کو یہ شعر پڑھایا:

الٰہی غنچۂ امید بکشای گلی از روضہ جاوید بنمای

سلطان سلیم نے شیخ کی خدمت میں پہنچ کر یہ شعر سنایا، انھوں نے تان سین کو بلا بھیجا، وہ حاضر ہوا اور گانا شروع کیا، شیخ نے بادشاہ اکبر کو بلایا، اور اپنی دستار شہزادے کے سر پر رکھ دی اور فرمایا کہ ہم سلطان سلیم کو اپنا جانشین بناتے ہیں، اس کے بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔ (ج ۲، ص ۸۲-۸۳)

فروردین ۱۰۲۸ میں عبدالستار نامی ایک شخص نے ہمایوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا مجموعۂ اوراد کا ایک نسخہ جہانگیر کو پیش کیا، اس کو دیکھ کر جہانگیر کو بیحد مسرّت ہوئی۔

(ج ۲، ص ۱۰۶-۱۰۷)

اجمیر کے قیام میں جہانگیر کی طبیعت خراب ہوئی، اسی درمیان اسلام خان حاکم بنگال نے اپنے ایک محرم راز سے کہا کہ عالم غیب سے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت شاہنشاہی کی طبیعت ناساز ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی عزیز چیز قربان کرے، چنانچہ اس نے طے کیا کہ وہ اپنی جان بادشاہ پر قربان کر دے گا، جیسے ہی اس نے یہ ارادہ کیا، اس کی صحت بگڑی اور وہ مر گیا، ادھر بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ (ج ۲، ص ۱۳۱)

اردی بہشت ۱۰۲۹ کے ذیل میں جہانگیر لکھتا ہے:

موضع راول پور (کشمیر) میں چنار کا ایک درخت ہے جو درمیان سے جلا ہوا ہے، آج سے بیس سال پہلے وہ (جہانگیر) گھوڑے پر سوار، سات سواروں اور دو خواجہ سراؤں کے ساتھ اس کے اندر داخل ہو گیا تھا، اکبر نامے میں اسی درخت کے متعلق ہے کہ بادشاہ اکبر نے ۳۴ آدمیوں کو اس میں بٹھایا تھا۔

(ج ۱، ص ۲۱۰)

اردی بہشت ۱۰۳۰ میں شاہ شجاع کو سخت چیچک نکلی، اس کے باپ کے زائچے میں تھا کہ اس سال اس کا کوئی بیٹا فوت ہوگا، چنانچہ سارے منجم اس بات پر متفق تھے کہ وہ اس مرض سے جاں بر نہ ہو سکے گا، برخلاف اس کے جوتک رائے منجم کا کہنا تھا کہ شہزادے کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں اس کی دلیل یہ تھی کہ جہانگیر کے زائچے میں ہے کہ بادشاہ کو اس سال کوئی غم نہ پہنچے گا، چونکہ بادشاہ کو اس شہزادے سے بہت تعلقِ خاطر تھا اس

لیے قیاس چاہتا ہے کہ اس کا انتقال نہ ہوگا ممکن ہے خرم کا کوئی دوسرا بیٹا انتقال کر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، خرم کا دوسرا بیٹا جو شاہ نواز کی بیٹی سے تھا برہانپور میں فوت ہو گیا، جوتک رائے کی صحیح تعبیر کی وجہ سے جہانگیر نے اسے سونے میں تلوانے کا حکم دیا۔

(ج ۲، ص ۲۷۸ - ۲۷۹)

---

۳۰ فروردین ۱۰۲۰ کو جالندھر کے ایک گاؤں میں طوفان آیا، اس وقت آسمان سے ایک روشنی زمین پر اترتی نظر آئی، اس سے لوگوں کا گمان ہوا کہ آسمان سے آگ برسنے والی ہے۔ جب شور و شغب میں کچھ کمی ہوئی تو عامل پرگنہ محمد سعید کو اطلاع دی گئی، وہ آیا اور اس نے دیکھا کہ دس بارہ گز زمین طول و عرض میں پوری طرح بھسم ہوگئی ہے، عامل نے اس کو کھودنے کا حکم دیا، زمین کھودی گئی اور اندر سے لوہے کا ایک تپتا ہوا ٹکڑا نکلا۔ ایسا گرم کہ گویا بھٹی سے ابھی نکلا ہو، عامل نے اسے جہانگیر کے پاس آگرہ بھیجا، اس کا وزن ۱۶۰ تولے نکلا، بادشاہ نے داؤد استاد کو دیا، اس نے تھوڑا سا قدرتی لوہا ملا کر اس سے دو تلواریں ایک خنجر اور ایک چاقو تیار کیا، جہانگیر نے ایک تلوار کا نام شمشیر قاطع اور دوسری کا برق سرشت رکھا۔ بے بدل خان نے یہ رباعی لکھی:

از شاہ جہانگیر جہاں یافت نظام — افتادہ بہ عہد او ز برق آہن خام
زاں آہن شد بہ حکم عالمگیرش — یک خنجر و کارد و دو شمشیر تمام

شعلہ برق بادشاہی اس کا مادہ تاریخ ہے۔ (ج ۲، ص ۲۷۹ - ۲۸۱)

یہی چاقو فری یر گیلری آف آرٹ، واشنگٹن میں آج بھی موجود ہے اور اس کے پھل پر ایک قطعہ موجود ہے۔

جہانگیر کو کلام حافظ سے بڑی دلچسپی تھی، وہ اُسے واقعی لسان الغیب جانتا تھا اور مشکل مواقع پر اس کے دیوان سے فال لیتا تھا، حسنِ اتفاق دیکھیے کہ وہ دیوان جس سے وہ فال دیکھتا تھا وہ ایک خاندانی نسخہ تھا، یہ نسخہ خدا بخش پٹنہ لائبریری میں محفوظ ہے جو دراصل مولوی سبحان اللہ گورکھپوری نے ہدیتاً بانی کتابخانہ کو اہدا کیا تھا، جہانگیر کی اکثر فال کا تفصیلی ذکر اس دیوان کے حاشیے میں ہے۔ ان فالوں پر مختلف

لوگوں نے الگ سے مقالے لکھے ہیں، اب تو پورے دیوان کی عکسی طباعت خدابخش لائبریری پٹنہ کی طرف سے ہو چکی ہے۔ تو زک جہانگیری، ص ۳۵۸، ۵۸۹ پر دو فالوں کا ذکر ہے اور یہ دونوں فالیں عکسی نسخے میں شامل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ تو زک جہانگیری سیاسی، علمی، فنی، ادبی امور کا ایسا دلچسپ مرقّع ہے جس کے مقابلے کسی دوسری کتاب کا پتا سارے فارسی ادب میں نہیں ملتا ہے، ایک مشہور محقق نے مغل دورِ حکومت کے تینوں شاہکار یعنی بابر نامہ، ہمایوں نامہ اور جہانگیر نامہ (تو زک جہانگیری) پر جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

اس برِّصغیر میں مغلوں نے اپنے تین سو سالہ ایامِ حکومت میں بہت سی لازوال نشانیاں چھوڑی ہیں، ان میں تین ایسی نشانیاں ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتیں، دنیا کی کوئی طاقت اور زمانے کی گردش ان کو نہ مٹا سکتی ہے اور نہ آنکھوں سے اوجھل کر سکتی ہے۔

مغلوں کے تین بڑے بادشاہوں کا کردار، ان کی اپنی شخصیتیں، ان کے عادات و اطوار، ان کے طریقۂ کار اور طرزِ عمل انھیں تین کتابوں کے ذریعے ہمارے سامنے اس طرح روشن ہو جاتے ہیں کہ ہم ان بادشاہوں کی شخصیتوں اور ان کے ادوار کی آب و ہوا سے کلّی طور پر آشنا اور متعارف ہوتے ہیں، اگر یہ تینوں کتابیں نہ ہوتیں تو واقعات و کوائف کا تجزیہ کرنا ناممکن بات تھی۔

یہ کتابیں سادہ زبان اور بے ساختہ عبارت میں لکھی گئی ہیں، اسی بنا پر خواہ ملکی معاملات ہوں خواہ شخصی واقعات یا خانگی مسائل، پڑھنے والا ان کی شخصیت میں ضم ہو کر رہ جاتا ہے اور لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان مغایرت کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں، اس کے بعد قاری ایک محرم راز کی حیثیت سے سیر کرنے لگتا ہے، یہ یقیناً مغلوں کے بڑے اور عظیم ہونے کی دلیل ہے، وہ اتنے عظیم تھے کہ ہر چیز کو انھوں نے جس طرح سمجھا یا دیکھا کسی ڈپلومیسی کے بغیر برملا کہہ دیا۔

رشید حسن خاں

غیر معتبر روایتیں

(۱)

تحقیق و تدوین میں یوں تو بہت سی مشکلیں ہیں، مگر اکثر صورتوں میں دو مشکلیں زیادہ پریشان کرنے والی ثابت ہوتی ہیں: ۱۔ غیر معتبر روایتیں، ۲۔ الحاقی کلام۔ داغ نے کہا ہے:

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اِس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تدوین اور تحقیق کی راہ میں دو چار سے کہیں زیادہ سخت مقام آتے ہیں۔ پہلے روایتوں کو لیجیے۔ بہت سی روایتیں یا تو سرے سے بے اصل ہوتی ہیں، یا مختلف وجوہ سے اُن میں ایسی تبدیلیاں شامل ہو جاتی ہیں جو بات کو بدل دیا کرتی ہیں۔ ان بہت سی وجہوں میں ایک بڑی وجہ نقلِ قول بھی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ غیر محتاط نقل کرنے والوں کے ہاتھوں بہت سے لفظ یا جملے بدل جاتے ہیں یا لفظوں اور جملوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اِس طرح وہ روایت کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ غیر تحقیقی رویّہ، شاعرانہ مزاج، عبارت کو دلچسپ بنانے کی کوشش اور زود یقینی؛ ہمارے بہت سے راویوں اور ناقلین میں یہ اجزا مشترک پائے جاتے ہیں؛ اِس لیے یہ حضرات احتیاط کے اُس طریقۂ کار کو ملحوظ نہیں رکھ پاتے جو صحتِ روایت کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ کبھی کسی خاص وجہ سے روایتوں کو تصنیف کیا جاتا ہے یا اُن میں سوچ سمجھ کر تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ نتیجہ ان سب باتوں کا ایک ہی ہوتا ہے کہ روایت غیر معتبر اجزا کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ تحقیق اور تدوین کا کام کرنے والوں کا سابقہ ایسی بے اصل یا مجروح روایتوں سے پڑتا رہتا ہے اور مشکلوں میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

ایک مشکل یہ سامنے آتی ہے کہ ایسی بہت سی روایتوں کے لکھنے والے معروف

لوگ ہوتے ہیں [جیسے میر امن، محمد حسین آزاد، سعادت خاں ناصر، خواجہ عشرت لکھنوی، نصیر حسین خیال، مفتی انتظام اللہ شہابی وغیرہ]۔ بہت سے ذہنوں میں پرانی تہذیبی روایت کا پیدا کیا ہوا حسنِ ظن کارفرما رہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی بات پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی بار ایسی کوئی روایت کاغذ پر منتقل ہو جائے تو پھر دوسرے آسان پسند اور خوش عقیدہ لوگ بلا تکلف اُس کی بنیاد پر نتائج نکال لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ شہرت، واقعے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

میں نے اب تک پانچ کلاسیکی متن مرتب کیے ہیں۔ اُن میں سے چار متن چھپ چکے ہیں: فسانۂ عجائب، باغ و بہار، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق۔ پانچواں متن سحر البیان ہے جو زیرِ کتابت ہے۔ ان میں سے ہر متن کے سلسلے میں ایسی روایتیں ملیں جو یا تو بے اصل تھیں، یا نقلِ روایت کے نتیجے میں روایت کی اصل صورت برقرار نہیں رہ پائی تھی۔ بطورِ مثال یہاں سحر البیان کے سلسلے کی بعض روایتوں کی نشان دہی کی جاتی ہے، اِنھی چند

لہ ممتاز حسین (مرحوم) نے باغ و بہار کو طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا [کراچی ۱۹۵۸ء] اُس کے مقدمے میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے حوالے سے میر امن کا سالِ وفات بھی لکھا گیا تھا [جس سے حقیقتاً اب تک کوئی واقف نہیں]۔ مفتی صاحب نے ایک تذکرے کی فارسی عبارت پیش کی تھی جس میں صاف صاف میر امن کی تاریخِ وفات مندرج تھی۔ دو اور کتابوں کے بھی نام لکھے تھے تصدیقِ مزید کے طور پر۔ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مفتی صاحب نے ممتاز حسین صاحب کو دھوکا دیا تھا، اِس طور پر کہ پہلے ایک فارسی عبارت تصنیف کی اور اس کے لیے ایک تذکرے کا غلط حوالہ دیا۔ پھر دو کتابوں کے نام تصنیف کیے اور اُن سے اُس عبارت کی مزید تصدیق کرائی۔ اِس طرح پورا جعل بنا کر ممتاز صاحب کے حوالے کر دیا۔ ممتاز صاحب محقق تو تھے نہیں، انھوں نے اُس کو درجِ کتاب کر لیا بلا تامّل۔ ممتاز صاحب نے اُس کے بعد جب وہ ایک بار دہلی آئے تھے تو مجھ سے کہا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مفتی صاحب پورا واقعہ تراش لیں گے اور عبارت گڑھ لیں گے۔ باغ و بہار (مرتبۂ راقم الحروف) کے مقدمے میں اِس کی پوری تفصیل لکھی گئی ہے۔ [ص ۲۵-۲۶]۔ میں اُس وقت تک مفتی صاحب کے کمالات سے واقف نہیں تھا۔ یہ پہلا تعارف تھا اُن سے۔

مثالوں سے پریشان کن صورتِ حال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) سحرالبیان جب آصف الدّولہ کے سامنے پیش کی گئی، تو اُس پر بہ طورِ صلہ کیا ملا تھا؟ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ۱۸۰۵ء میں یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اِس اشاعت میں میر شیر علی افسوس کا مقدمہ شامل ہے جس میں میرحسن سے متعلق کئی اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ افسوس اپنے قول کے مطابق دس برس تک میرحسن کے ساتھ ایک ہی سرکار میں بہ ذیلِ مصاحب ملازم رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مقدمے میں مثنوی سحرالبیان کے حوالے سے لکھا ہے :

"صلے کا اُس کے ماجرا یہ ہے کہ نوّاب وزیرالممالک آصف الدّولہ مرحوم نے ایک دوشالا خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچے میں سے نکلوا کر مصنّف کو عنایت کیا۔ رتبہ تو اُس کا البتّہ بڑھا، پر دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلبِ دلی حاصل نہ ہوا۔ لیکن یہ صرف کھوٹ طالع کی ہے؟ کیونکہ مال کھرا خریدار اتنا بڑا اور سود اخاطر خواہ نہ ہوا، بلکہ گھاٹا آیا۔"

افسوس کی عبارت بہت صاف ہے، بہت واضح ہے۔ ایسا کوئی قرینہ یا وجہ موجود نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ اُنھوں نے صحیح بات نہیں لکھی۔ وہ اُس وقت یعنی اِس واقعے کے وقت لکھنؤ میں موجود تھے اور میرحسن اور وہ، دونوں اُس وقت تک نوّاب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم تھے اور اُنھی کے الفاظ میں "راقم کو اُس سے دوستیِ دلی تھی۔" اِس لیے اُن کی اِس روایت پر بہ ظاہر کسی طرح کا شک وارد نہیں ہوتا؛ لیکن دو روایتیں اس سے مختلف ملتی ہیں۔ پہلی روایت تو تذکرۂ طبقاتِ سخن کی ہے۔ میرحسن کے احوال میں مولّفِ تذکرہ نے لکھا ہے :

"چوں ملازمِ سرکارِ نوّاب آصف جاہ (کذا) گردید، وقتے مزاجِ آصف جاہ از طرفِ او آزردہ گردید واز لکھنؤ بدر کردند۔ بعدِ چندے کہ سحرالبیان را بہ فصاحتِ تمام در زبانِ محل طرح دادہ بہ حضور آوردہ بسیارے از صلہ و اکرام سرفرازی یافت۔ چنانچہ امروز آں قصّہ اشتہارِ تمام دارد۔"

[طبقاتِ سخن، عکسی اڈیشن، مرتبۂ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی خاں، ص ۸۲]

مولّفِ تذکرہ (محی الدین مبتلا و عشق میرٹھی) نے تین باتیں لکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میرحسن آصف الدّولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ دوسری بات یہ لکھی ہے کہ نوّاب نے کسی وقت ناراض ہوکر اُن کو لکھنؤ سے نکال دیا تھا۔ تیسری یہ بات کہ جب سحرالبیان نوّاب کے سامنے پیش کی گئی تو بہت صلہ ملا۔ [آصف الدّولہ کو دونوں جگہ "آصف جاہ" لکھا گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلطی خود مولّف نے کی ہے یا اِس تذکرے کے ناقل نے] تینوں باتیں قابلِ قبول نہیں۔ [مقدمۂ سحرالبیان میں مَیں نے ان تینوں باتوں سے مفصّل بحث کی ہے]۔

مولّفِ تذکرہ نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، بس یہ لکھا ہے کہ یہ قصّہ بہت مشہور ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ انھوں نے سُنی سُنائی کو بہ طورِ روایت درجِ تذکرہ کرلیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ آج یہ قصّہ بہت مشہور ہے۔ شہرت کا احوال یہ ہے کہ مولّفِ تذکرہ کے سوا [اُن سے پہلے کا] اور کوئی مصنّف یا مولّف اِس سے واقف نہیں۔ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ آصف الدّولہ نے ناراض ہوکر میرحسن کو شہر بدر کردیا تھا۔ اِس بات کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں کہ میرحسن دربارِ آصف الدّولہ سے توسّل رکھتے تھے [وہ نوّاب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم تھے]۔ یہ بات بھی کسی نے نہیں لکھی کہ میرحسن کو بہت سا (نقد) صلا ملا تھا۔ غرض کہ تذکرۂ طبقاتِ سخن کی یہ مکمّل روایت ناقابلِ قبول ہے۔ اِس سلسلے کی دوسری روایت سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے خوش معرکۂ زیبا میں درج کی ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

> "نوّاب قاسم علی خاں بہادر نے جب مثنوی اُن سے سنی، فرمایا کہ مجھے دو، میں تمھاری طرف سے حضور میں نوّاب آصف الدّولہ بہادر کے لے جاؤں۔ مصنّف نے بہ خیال اِس کے، مبادا اور کسی نام سے حضور میں گزرے، مثنوی کے دینے میں انکار کیا۔
>
> بعدِ چندے میرحسن صاحب مع مثنوی اور کسی کی تقریب سے حضور میں پہنچے۔ نوّابِ سابق الذکر افسانۂ رفتہ سے آزردگی رکھتے تھے، نوّاب صاحب

کی تعریف میں بول اُٹھے: یہ جو کہتے ہیں، مصرع:

کہ اک دن دو شالے دیے سات سَے[۱]

حضور نے تو ہزارہا دو شالے آنِ واحد میں بخش دیے ہیں۔ شاعری میں مبالغہ ہوتا ہے، یہاں بیانِ واقع میں بھی کمی۔ نوابِ نامدار کا دل اِس کے سننے سے اُچاٹ ہوا۔ یہ فقط کم نصیبی میر موصوف کی تھی کہ ایسے حاتمِ دوراں کی سخاوت سے ناکام رہا۔" [خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، جلد اوّل، ص ۴۱]۔

یہ اچھی خاصی کہانی ہے۔ ناصر سے پہلے یہ حکایت نما روایت کسی نے نہیں لکھی۔ اِس روایت نے ناصر کے تذکرے میں خاصی مدّت کے بعد جگہ پائی ہے۔ مثنوی سحرالبیان کا سالِ اختتامِ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔ محرم ۱۲۰۱ھ میں میر حسن کا انتقال ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ (بالفرض) ایسا کوئی "واقعہ" ہوا بھی ہوگا تو وہ اِسی مدّت میں ہوا ہوگا۔ ناصر کے تذکرے کا آغاز ۱۲۶۱ھ میں ہوا ہے۔ ساٹھ اکسٹھ برس کی مدّت میں کسی بے بنیاد بات کا، جبکہ اُس میں کہانی پن بھی ہو، مشہور ہو جانا کچھ اَن ہونی بات نہیں۔ یہ بھی بہ خوبی ممکن ہے کہ یہ کہانی خود ناصر کی تصنیف ہو۔ اِس تذکرے میں ایسی غیر معتبر روایتیں متعدد ملتی ہیں۔ اِس تذکرے کے مرتب مشفق خواجہ کے بقول ناصر کا شوقِ قصہ گوئی ایسی روایتوں کے شمول کا ذمّے دار ہے۔

روایتیں بدلتی کس طرح ہیں، اِس کی بہت اچھی مثال میں اِسی روایت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اِس روایت کی پہلی شکل ناصر کے تذکرے میں ملتی ہے [جسے اوپر نقل کر دیا گیا ہے] اس کے بعد دو اور کتابوں میں اِسے نقل کیا گیا، اُن میں سے ایک مجموعۂ سخن ہے اور دوسری کتاب ہے بوستانِ اودھ۔ اِن دونوں میں اِس روایت کے کئی ٹکڑے بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجموعۂ سخن سے یہ روایت دو موخر کتابوں میں نقل کی گئی۔ پہلی کتاب ہے ڈاکٹر فضل الحق کا تحقیقی مقالہ میر حسن: حیات اور ادبی خدمات۔ دوسری کتاب ہے ڈاکٹر اکبر حیدری کا مرتب

۱؎ آصف الدولہ کی سخاوت کے بیان میں میر حسن نے لکھا ہے:

سخاوت یہ ادنیٰ سی ایک اُس کی ہے — کہ اک دن دو شالے دیے سات سَے

کیا ہوا نسخۂ مثنوی سحر البیان۔ اِن دونوں کتابوں میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اِس روایت کو مجموعۂ سخن سے نقل کیا گیا ہے۔ اِن دونوں موخّر نقل کرنے والوں کی عبارت میں بھی تین جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں پہلے مجموعۂ سخن کی روایت کو لیتا ہوں اور اِسے ڈاکٹر فضل الحق کے مقالے سے نقل کرتا ہوں۔ قوسین میں نسخۂ ڈاکٹر اکبر حیدری کے اختلافات لکھے جائیں گے:

"جب قصۂ بے نظیر کہہ کر نواب آصف الدّولہ کے حضور میں سنایا [حیدری: آصف الدّولہ بہادر کے حضور میں سنائی] تب انھوں نے ایک دوشالہ ملبوسِ خاص عنایت فرمایا۔ لیکن عجیب واقعہ یہ ہوا کہ [حیدری: عجب واقعہ ہوا کہ] مثنوی سناتے سناتے نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں یہ مصرع نکل آیا: کہ اک دن دوشالے دیے سات سئے۔ اور چونکہ آصف الدّولہ بہادر کے حکم سے ایک دن میں چودہ سو دوشالے بانٹے گئے تھے [اور چونکہ آصف الدّولہ بہادر دن میں چودہ سو دوشالے بانٹتے تھے (حیدری)] پس یہ مصرع سن کر نہایت بد دماغ ہوئے، بلکہ مشہور یہ بھی ہے کہ قید بھی کیا۔ اِس وجہ سے بعض لوگ مثنویِ مذکور کو منحوس کہتے ہیں" [ص ۲۳۱]۔

ایک ہی کتاب سے ایک روایت نقل کی گئی، مگر ایک جگہ یہ ہے: "آصف الدّولہ بہادر کے حکم سے ایک دن میں چودہ سو دوشالے بانٹے گئے تھے" اور دوسری نقل میں یہی بات اِس طرح سامنے آتی ہے: "آصف الدّولہ بہادر دن میں چودہ سو دوشالے بانٹتے تھے۔" بات کس قدر بدل گئی!

اصل روایت تو خوش معرکۂ زیبا کی ہے، جب اُس نے مجموعۂ سخن میں جگہ پائی تو کس صورت میں۔ پہلی روایت (خوش معرکۂ زیبا) میں ہے کہ "نوابِ نامدار کا دل اُس کے سننے سے اُچاٹ ہوا۔" دوسری روایت (مجموعۂ سخن) میں ہے کہ "یہ مصرع سن کر نہایت بد دماغ ہوئے۔" پہلی روایت کے مطابق نواب قاسم علی خاں کے توجہ دلانے پر نواب کا دل مثنوی سننے سے اُچاٹ ہوا اور اِس دوسری روایت میں یہی بات بدل کر یوں بنی کہ متعلقہ مصرع سن کر بد دماغ ہوئے۔ اِس کے علاوہ، دوسری روایت میں اِس

ٹکڑے کا اضافہ ہو گیا: "بلکہ مشہور یہ بھی ہے کہ قید بھی کیا۔" اس اضافے کے ساتھ یہ ایک اور اضافہ بھی ہوا: "اس وجہ سے بعض لوگ مثنویِ مذکور کو منحوس کہتے ہیں۔"

پہلی روایت (خوش معرکہ) میں ہے کہ "حضور نے تو ہزار ہا دوشالے آنِ واحد میں بخش دیے ہیں۔" دوسری روایت (مجموعہ) میں یہی بات اِس شکل میں سامنے آتی ہے: "چونکہ آصف الدولہ بہادر کے حکم سے ایک دن میں چودہ سو دوشالے بانٹے گئے تھے" ["دن میں چودہ سو دوشالے بانٹتے تھے"]۔ بات ہی بدل گئی۔

ڈاکٹر فضل الحق نے اپنے محوّلۂ بالا تحقیقی مقالے میں بوستانِ اودھ کی یہ روایت نقل کی ہے:

"مثنوی بہ بحرِ متقارب بر قصۂ بے نظیر و بدرِ منیر بر نامِ آصف الدولہ گفتہ پیش نمود۔ اتفاقاً در مدح ایں شعر برآمد: سخاوت یہ ادنیٰ سی .... ازآں جاکہ نوابِ والاجناب قبل ازیں بہ دوسہ روز یک ہزار و چہار صد دوشالہ مقربین و تابعین را مرحمت فرمودہ بود، بنا برآں مضمونِ شعر خلافِ مزاج افتاد و ہماں دم حکمِ اخراجش فرمودند۔ تا میرِ موصوف قطعِ تعلق ازآں جا نمودہ چار و ناچار اختیارِ غربت و کربت نمود" [ص ۲۳۰]۔

اِس روایت میں دو روایتوں کے اجزا یک جا ہو گئے ہیں۔ ایک روایت تو تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا والی ہے، اور دوسری روایت وہ ہے جسے مبتلا نے طبقاتِ سخن میں درج کیا ہے۔ ناصر [مؤلفِ خوش معرکۂ زیبا] کی روایت میں ہے: "ہزارہا دوشالے آنِ واحد میں بخش دیے ہیں" [اس بیان کے سلسلے کی یہ پہلی یا یوں کہیے کہ اصل روایت ہے]۔ مجموعۂ سخن میں یہی بات یوں ملتی ہے: "ایک دن میں چودہ سو دوشالے بانٹے گئے" اور بوستانِ اودھ میں "ایک دن" کی جگہ "دوسہ روز" نے لے لی اور "مقربین و تابعین" کے الفاظ کا اضافہ ہو گیا۔

پہلی روایت میں ہے: "نوابِ نامدار کا دل اس کے سننے سے اُچاٹ ہوا۔" مجموعۂ سخن میں یہی بات صورت بدل کر یوں سامنے آئی: "یہ مصرع سن کر نہایت بد دماغ ہوئے۔" اور اضافہ یہ ہوا: "بلکہ مشہور یہ بھی ہے کہ قید بھی کیا۔" بوستانِ اودھ میں

قید کا ذکر نہیں، اُس کی جگہ یہ ہے: "ہماں دم حکم اخراجش فرمودند"۔ اِس کے ساتھ ہی طبقاتِ سخن کی روایت کو بھی دیکھیے جس میں یہ لکھا گیا ہے: "وقتے مزاجِ آصف جاہ (کذا) از طرفِ او آزردہ شد و از لکھنؤ بدر کردند۔ بعد چندے کہ سحر البیان را... بہ حضور آورد، بسیارے از صلہ و اکرام سرفرازی یافت"۔ صاحب طبقاتِ سخن کے لکھنے کے مطابق میر حسن کے لکھنؤ سے نکالے جانے کا واقعہ سحر البیان کی تصنیف سے پہلے کا ہے، اور صاحب بوستانِ اودھ کے بیان کے مطابق مثنوی کی تصنیف کے بعد کا ہے۔ مبتلا کے بیان کے مطابق آصف الدولہ کسی بات پر میر حسن سے ناراض ہو گئے تھے [اُس بات کی وضاحت نہیں کی گئی] اور بوستانِ اودھ کے قول کے مطابق سحر البیان کا متعلقہ شعر [جس میں ایک دن میں سات سو دو شالے دینے کا بیان ہے] ناراضی کی وجہ بنا۔

اِن مختلف بیانات سے بہ خوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ روایتیں کس طرح بدلتی رہتی ہیں۔ اسی لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ایسی ہر روایت کو تجزیے اور تقابل کی روشنی میں دیکھا جائے، خاص کر اُن لوگوں کی روایتوں کو جو واقعہ تراشی میں تکلف سے کام نہیں لیتے۔ مثلاً تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے مولف سعادت خاں ناصر کے بہت سے بیانات اِسی ذیل میں آتے ہیں۔ محض بہ طورِ مثال عرض کروں کہ ناصر نے میر حسن کے حالات کے تحت اِسی مثنوی سحر البیان کے سلسلے میں لکھا ہے:

> "یہ بھی کیا خوب لطیفہ ہے کہ جب مرزا رفیع سودا نے وہ مثنوی سنی، نہایت خوش ہوئے اور عین بشاشت میں فرمایا: تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ میر غلام حسین کے بیٹے نہیں معلوم ہوتے، یعنی فخر اُن کے ہو"۔ (ص ۴۱)

سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور اِس مثنوی کا سالِ تکمیل تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔ اگر ناصر کی اِس روایت کو مان لیا جائے، تو یہ بھی ماننا ہو گا کہ یہ مثنوی سودا کی زندگی میں لکھی جا چکی تھی اور یہ بات کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ یہاں واضح طور پر ناصر کا شوقِ قصہ گوئی کارفرما ملتا ہے۔ اِس تذکرے کے مرتب مشفق خواجہ نے اپنے مقدمے میں بجا طور پر لکھا ہے: "ناصر کا شوقِ قصہ گوئی ہے جو ایسے ہر واقعے کو دلچسپ سے دلچسپ بنانے پر مجبور کرتا ہے"۔ (ص ۵۸)

اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قبولِ روایت کے سلسلے میں احتیاط کے

سخت گیر تقاضوں کا مطالبہ کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے اور روایتوں کو جانچنا پرکھنا کیوں ضروری ہے۔ میں مزید وضاحت کی غرض سے مثنوی زہرِ عشق کے سلسلے کی دو مثالوں کا حوالہ دوں گا۔ مثنویاتِ شوق کی تدوین کے دوران ایسی متعدد پریشان کن روایتوں سے سابقہ پڑا تھا۔ یہاں صرف دو مثالوں کا حوالہ دیا جائے گا۔

مثنویاتِ شوق، خاص کر مثنوی زہرِ عشق کی اشاعت پر کیا کبھی پابندی لگی تھی؟ اس سلسلے میں متعدد روایتیں ملتی ہیں۔ [ان روایتوں کی تفصیل مثنویاتِ شوق مرتبۂ راقم الحروف میں دیکھی جاسکتی ہے]۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے شوق سے متعلق ایک مقالے میں زہرِ عشق کے حوالے سے لکھا ہے:

"لکھنؤ میں جب شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا، تو کسی کمپنی نے اس تماشے کو اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ جنازے کا منظر اور اس کے پیچھے غم زدہ والدین کا ماتم کرتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے چلنا جب دکھایا گیا تو تماشا گاہ ایک بزمِ عزا بن گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں تو ہر طرف سے آرہی تھیں، بعضوں کو غش آگئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشے کا دکھانا قانوناً ممنوع کردیا گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصے تک بند رہی۔" [مقالۂ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مشمولۂ زہرِ عشق، مرتبۂ مجنوں گورکھپوری، ص ۷۶]۔

اب اسی روایت کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھیے۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے کلیاتِ شوق میں زہرِ عشق کے ذیل میں لکھا ہے:

"اس مثنوی کی شہرت باذوق حضرات ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اس دور کی تھیٹر کمپنیوں نے بھی اس کو ڈرامے کی شکل دے کر بہت ہی موثر انداز میں جگہ جگہ پیش کیا۔ ایسا مشہور ہے کہ ایک بار لکھنؤ میں کسی تھیٹر کمپنی نے اس مشہور مثنوی کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک لڑکی نے اس عشقیہ داستان سے متاثر ہو کر

> خودکشی کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند نے اِس کو اسٹیج پر پیش کرنے کی ممانعت کردی اور اس کے مضامین کو عریاں قرار دے کر، اِس کی طباعت اور اشاعت پر پابندی عائد کردی۔" [کلیاتِ شوق، ص ۲۹]۔

پہلی بار مولانا عبدالماجد کا یہ مضمون " رسالہ سہیل (علی گڑھ) کے اپریل، مئی اور جون نمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا" [عطاء اللہ پالوی: تذکرۂ شوق، ص ۱۳۶] شاہ صاحب کا مرتبہ کلیات ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اکیاون برس کی مدت میں اس روایت میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ اُس کی صورت ہی بدل گئی یا یوں کہیے کہ بگڑ گئی تھیٹر کمپنیوں نے اس مثنوی پر مبنی تماشے کو جگہ جگہ پیش کیا، اِس ٹکڑے کا اضافہ ہو گیا۔ "پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے" کی جگہ "ایسا مشہور ہے" نے لے لی۔ اِس کے بعد جو ٹکڑا اصل روایت میں ہے کہ جنازے کا منظر اور غم زدہ والدین کا ماتم کرتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے چلنا جب دکھایا گیا، تو تماشا گاہ، بزم عزا بن گئی، بعضوں کو غش آگئے؛ یہ سارا منظر جس نے اُس روایت کو حقیقی روشنی بخشی ہے، غائب ہو گیا۔ سب سے بڑی تبدیلی، جس نے اُس روایت کو یکسر بدل دیا، یہ ہوئی کہ جہاں اصل روایت میں تھا کہ " ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی" [اس میں لفظ "شاید" خاص طور پر توجہ طلب ہے] وہاں یہ قطعی "واقعہ" آگیا کہ " ایک لڑکی نے اس عشقیہ داستان سے متاثر ہو کر خودکشی کرلی"۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بیان بھی کہ اُس لڑکی کے خودکشی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "حکومتِ ہند نے اِس کو اسٹیج پر پیش کرنے کی ممانعت کردی اور اشاعت پر پابندی عائد کردی۔" اِس طرح یہ بالکل نئی وجہ پابندی کی سامنے آئی کہ ایک لڑکی کے خودکشی کرلینے کی وجہ سے کھیل اور کتاب، دونوں پر حکومتِ ہند نے پابندی لگادی۔

میں یہاں ایک بات پر خاص کر زور دینا چاہتا ہوں کہ مثنوی گلزارِ نسیم کی تدوین کے دوران اُس سے متعلق متعدد روایتیں میرے سامنے آئیں۔ مثلاً یہ لکھا گیا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے' یا یہ کہ فلاں صاحب کے بھائی، شاگرد یا داماد

نے خود مجھ سے یہ کہا تھا، یا میرے سامنے یہ روایت بیان کی تھی؛ جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ایسی سبھی روایتیں خانہ ساز تھیں۔ ایسی روایتوں کے بیان کرنے والے کون تھے؟ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور پنڈت برج نرائن چکبست جیسے حضرات تھے۔ تب سے میں ایسی روایتوں کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوں، خاص کر ایسی روایتیں جن پر کسی واقعے کے ہونے نہ ہونے کا دار و مدار ہو۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ روایت کی اصل تو ہے، مگر نقلِ روایت میں اس کا چہرہ مہرہ بگڑ گیا ہے۔ چونکہ بہ طورِ عموم ایسے نقل کرنے والے اپنے ماخذ کا حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ یوں کہوں کہ مصلحتاً حوالہ نہیں دیتے، اس لیے الفاظ یا واقعات کو بدل دینے میں انھیں ذرا بھی تکلف نہیں ہوتا۔ ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے کی بیان کی ہوئی روایت خود ان کی دریافت بن جاتی ہے۔ حوالہ دیا جائے تو وہ دریافت اُن کی فتوحات کے حساب میں درج نہیں ہو سکے گی۔ مولانا ماجد کی منقولۂ بالا روایت کی یہ بگڑی ہوئی نقل اسی ذیل میں آتی ہے۔ خود مولانا ماجد کی بزرگوں سے سنی ہوئی روایت کو سلسلۂ کلام کے تحت پیش تو ضرور کیا جائے گا، مگر محض اس سُنی ہوئی روایت کی بنیاد پر کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

میں زہرِ عشق کے سلسلے کی بس ایک اور روایت کا حوالہ دوں گا۔ اس حوالے سے مزید وضاحت ہو سکے گی کہ کسی دوسرے کی روایت کو (بدل کر یا بگاڑ کر) اپنے نام سے پیش کرنے کی خواہشِ بے جا یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ اس طرح مفت میں، بغیر کچھ کیے دھرے وہ ناقل، صاحبِ دریافت بن جاتا ہے۔ یہ خیال یقین بن کر دل میں بیٹھ جاتا ہے کہ کوئی کچھ کہے گا نہیں۔

نظامی بدایونی نے پہلی بار ۱۹۱۹ء میں مثنوی زہرِ عشق کا ایک نسخہ شائع کیا تھا۔ یہ دوسری بار انھی کے اہتمام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ یہ دوسری اشاعت پیشِ نظر ہے۔ نظامی نے اس مثنوی پر جو دیباچہ لکھا تھا، اُس میں یہ اطلاع دی ہے:

"مثنوی زہرِ عشق کا صحیح سالِ تصنیف ہمیں مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوا جو ایک قلمی نسخے میں نظر پڑا تھا۔ یہ قطعۂ تاریخ

حافظ حکیم حاجی مجاہد الدین ذاکر بدایونی نے... جب وہ لکھنؤ میں علم طب
کی تحصیل کرتے تھے اور نواب مرزا شوق سے رابطۂ اتحاد رکھتے تھے...
مرزا صاحب کے اصرار سے لکھا تھا۔" (ص ۲)

اس کے بعد انھوں نے وہ قطعۂ تاریخ درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی زہرِ عشق کا سال تصنیف ۱۲۷۷ھ ہے۔ اس روایت کے اوّلین راوی نظامی بدایونی ہیں اور یہ انھی کی دریافت ہے۔ عشرت رحمانی نے مثنوی زہرِ عشق کو طویل مقدّمے کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس میں ۱۳۴ صفحے کا مقدمہ ہے۔ مذکورۂ بالا قطعۂ تاریخ کو انھوں نے اپنے مقدمے میں اس طرح درج کیا جیسے یہ اُن کی دریافت ہو۔ انھوں نے وضاحتاً یہ نہیں لکھا، مگر اندازِ بیان ایسا اختیار کیا جس سے مترشح یہی ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دریافت ہے۔ عشرت رحمانی نے لکھا ہے:

"مثنوی زہرِ عشق کا سالِ تصنیف ۱۲۷۷ھ بتایا جاتا ہے جو ذیل کے قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے... یہ قطعۂ تاریخ ایک قلمی نسخے سے حاصل ہوا۔ حافظ حکیم مجاہد الدین ذاکر بدایونی، نواب مرزا شوق کے ایک مخلص دوست تھے حکیم صاحب اُس زمانے میں لکھنؤ میں مطب کرتے تھے، جب یہ مثنوی تصنیف ہوئی، شوق نے حکیم صاحب سے تاریخ کی فرمائش کی اور انھوں نے دوست کی تعمیل میں (کذا) یہ قطعہ کہا جو سب سے پہلے قلمی نسخے میں شامل کیا گیا" [زہرِ عشق، مرتبۂ عشرت رحمانی، ناشر مکتبۂ اردو لاہور، ص ۱۱۷]۔

عشرت صاحب نے اور سب کچھ لکھا، مگر اصل بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ قطعۂ تاریخ انھوں نے دراصل نظامی بدایونی کے شائع کردہ نسخۂ زہرِ عشق میں دیکھا تھا۔ اس کے بجائے انھوں نے ایسا مبہم اور پہلو دار اندازِ بیان اختیار کیا جس سے بہ آسانی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ انھی کی دریافت ہے۔ یہ محض قیاس یا خیال نہیں، ایسا ہوا ہے، یہ بات لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر سیّد محمد حیدر نے اپنے تحقیقی مقالے حیاتِ شوق [نظامی پریس لکھنؤ۔ سالِ طبع ۱۹۹۱ء] میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ عشرت رحمانی کی دریافت ہے: "عشرت رحمانی صاحب

نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ انھیں ایک قلمی نسخے سے حاصل ہوا" [ص ۲۷۶]۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین کی معروف کتاب ہے، اُس میں انھوں نے بھی یہی لکھا ہے: "عشرت رحمانی صاحب نے دیباچۂ زہرِ عشق میں پورا قطعہ درج کر دیا جو انھیں مثنوی کے ایک قدیم مخطوطے میں ملا" [انجمن ترقی اُردو ہند اڈیشن، ص ۷۱۱] اِس طرح ایک بے اصل بات نے کئی کتابوں میں درج ہو کر مستقل روایت کا درجہ حاصل کر لیا۔

عشرت رحمانی کی روایت میں اصل روایت کے بعض اجزا بھی بدل گئے ہیں۔ ۱۔عشرت نے لکھا ہے: "ذاکر بدایونی نواب مرزا شوق کے ایک مخلص دوست تھے۔ حکیم صاحب اُس زمانے میں لکھنؤ میں مطب کرتے تھے"۔ اصل روایت [یعنی نظامی بدایونی کی روایت] کے الفاظ یہ ہیں: "جب وہ لکھنؤ میں علمِ طب کی تحصیل کرتے تھے اور نواب مرزا شوق سے رابطۂ اتحاد رکھتے تھے"۔

یعنی اصل روایت کے مطابق ذاکر نے جب زیرِ بحث قطعہ لکھا تھا، تو اُس وقت اُن کا زمانۂ طالب علمی تھا، علمِ طب پڑھ رہے تھے۔ عشرت کے الفاظ میں وہ اُس وقت مطب کرتے تھے۔ بات ہی بدل گئی۔

نظامی نے لکھا ہے کہ ذاکر "نواب مرزا شوق سے رابطۂ اتحاد رکھتے تھے"۔ یہ خاصا محتاط اندازِ بیان ہے۔ اِس کا اندازہ صحیح طور پر اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ ۱۲۷۷ھ میں، جو اِس قطعۂ تاریخ کے مطابق زہرِ عشق کا سالِ تصنیف ہے، شوق کی عمر تقریباً اسّی برس کی تھی اور ذاکر اس وقت صرف چھبیس [۲۶] برس کے تھے۔ عشرت کے الفاظ "مخلص دوست تھے" سے تصویر کا رنگ بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شوق اور ذاکر تقریباً ہم عمر تھے۔

عشرت نے اسی سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے: "نظام الدین صاحب نے حکیم صاحب مرحوم (ذاکر بدایونی) کا ایک قلمی نسخہ حاصل کر کے ... یہ مثنوی شائع کی"۔ یہ قطعی طور پر بے سر و پا بات ہے۔ نظامی نے اپنے مقدمۂ زہرِ عشق میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انھوں نے ذاکر بدایونی کا ایک قلمی نسخہ حاصل کر کے یہ مثنوی شائع کی۔ وہ یہ بات لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ نظامی کے شائع کردہ متن کی بنیاد کسی عام بازاری غیر معتبر اڈیشن

پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس میں الحاقی اشعار بھی موجود ہیں۔ عشرت نے جو کچھ لکھا ہے، یہ اُن کی اپنی اُپج ہے۔ اِس طرح عشرت کی تحریر میں روایت کے اِس حصّے کی صورت بدل گئی ہے، یا یوں کہیے کہ بگڑ گئی ہے [اِن اُمور سے مفصّل بحث میں نے ایک الگ مضمون میں کی ہے جو میری کتاب "تدوین۔ تحقیق۔ روایت" میں شامل ہے]۔

میرے بعض احباب کو مجھ سے شکایت رہی ہے (اور رہتی ہے) کہ میں قبولِ روایت کے سلسلے میں بے جا سخت گیری سے کام لیتا ہوں۔ میری مشکل یہ ہے کہ جو روایتیں سامنے آتی ہیں، اُن میں بہت سی روایتیں غیر معتبر ہوتی ہیں، گڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یا پھر نقلِ روایت میں اُن کے اجزا میں ایسی تبدیلیاں ہو جایا کرتی ہیں کہ اصل روایت کی صورت جگہ جگہ سے بدل جاتی ہے۔ عبارت میں آب و رنگ پیدا کرنے کی خاطر بھی انشا پردازی کا اور غلط بیانی کا اِس طرح سہارا لیا جاتا ہے کہ واقعہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ ایسی روایتوں کو بے چون و چرا مان لینے کے لیے جاہلانہ خوش عقیدگی اور بہت سادہ لوحی کی ضرورت ہے اور اِن باتوں کو ادبی تحقیق اور تدوین کے طریقۂ کار سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔

قومی اُردو کونسل کی مطبوعات (فرہنگ اصطلاحات)

فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	۲۷/=
فرہنگ اصطلاحات تاریخ و سیاسیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۳۸/=
فرہنگ اصطلاحات حیوانیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۱۲/=
فرہنگ اصطلاحات ریاضیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۵/=
فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اور تعلیم	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۳۰/=
فرہنگ اصطلاحات کیمیا	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۸/=
فرہنگ اصطلاحات لسانیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۲۰/=
فرہنگ اصطلاحات معاشیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۱۰/=
فرہنگ اصطلاحات نباتیات	اُردو بیورو (انگریزی اُردو)	۱۵/=
فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض / حسن علی جعفری	۳۸/=

نیّر مسعود

اختلافِ نُسَخ کی نشاندہی

اختلافِ نُسخ کی نشاندہی اصلاً تدوینِ متن کا ایک ضمنی مسئلہ ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مرتب کا کام ہے کہ اپنے زیرِ تدوین متن کی مختلف صورتوں میں سے کس کو اصل متن کی حیثیت سے اختیار کرے اور کن کو اختلافِ نُسخ کے تحت حواشی میں جگہ دے۔ ہماری گفتگو کا موضوع متن کی تعیین کا مسئلہ نہیں بلکہ متن میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی کا مسئلہ ہے جو عموماً متن کے ایک سے زائد نسخوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، متن کے واحد یا منحصر بہ فرد نسخے میں بھی یہ مسئلہ سامنے آتا ہے۔

کسی متن کے مختلف نسخوں میں جن اسباب سے اختلافات رونما ہوتے ہیں انھیں کے لحاظ سے ان کی نشاندہی کے اصول اور حدود معیّن ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ خود مصنّف اپنی تحریر میں تبدیلیاں کر دیتا ہے۔ ان سب تبدیلیوں کی نشاندہی بنیادی اور سب سے اہم کام ہے۔

۲۔ متن کی مختلف قلمی نقلوں یا مطبوعہ نسخوں میں کاتب یا مصحّح کے ہاتھوں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس کا پتا لگانا کبھی ممکن اور کبھی ناممکن ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کا ذمّہ دار خود مصنّف ہے یا یہ کاتب کا سہو یا مصحّح کی (ارادی یا غیر ارادی) تحریف ہے۔ ان صورتوں میں تبدیلی اگر با معنی ہو اور متن کو مہمل نہ کر رہی ہو تو اس کی نشاندہی ضروری ہے۔ کاتبوں اور تصحیح کرنے والوں کی انفرادیتوں کی وجہ سے ایک ہی متن کے مختلف مخطوطوں اور ایڈیشنوں میں تلفّظ اور املا وغیرہ کے اختلافات در آتے ہیں۔ مثلاً "یھاں" "وھاں" اور "یاں، واں"،

"سیں" اور "سے"، "نئیں" اور "نہیں"، "پہنچنا" اور "پہونچنا"، "اُس سے" اور "اُوسے"
وغیرہ ۔ پرانی تحریروں میں بالعموم یائے معروف و مجہول، نون غنّہ و منقوطہ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض کاتب ک اور گ دونوں پر ایک ہی مرکز لگاتے تھے، بعض ٹ، ڈ، ڑ پر چھوٹے ط کے بجائے چار نقطے یا کوئی اور علامت بنا دیتے تھے۔ ان صورتوں میں پیدا ہونے والے نسخی اختلافات کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ان سب اختلافات کا اظہار اختلافِ نسخ کے تحت نہیں ہونا چاہیے، البتہ ان کی نوعیت کی نشاندہی مقدمۂ مرتب میں اس محل پر ہونا چاہیے جہاں زیرِ تدوین متن کے مختلف نسخوں کی املائی اور کتابتی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہو۔

۳۔ بعض نسخوں کے کاتب نقطوں کے استعمال میں اصولِ کتابت اور قواعدِ املا کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ منقوط حرفوں میں کسی پر نقطہ لگاتے کسی پر نہیں لگاتے تھے، کہیں نقطوں کی جگہ بدل دیتے اور کہیں بلا ضرورت نقطے لگا دیتے تھے۔ ان آزادیوں کے نتیجے میں متن کا ایک ہی لفظ مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا تھا، مثلاً لفظ "ناز" کو غیر محتاط کاتب "باز"، "نار"، "یار"، "تار"، "بار"، "پار" وغیرہ کی صورت میں بھی لکھ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ نسخے کو بہ غور پڑھنے سے بہ خوبی ہو سکتا ہے کہ اس کا کاتب نقطوں کے استعمال میں کس حد تک محتاط یا غیر محتاط ہے۔ اگر کاتب بالکل ہی غیر محتاط ہے تو اس کے لکھے ہوئے نسخے میں نقطوں کے فرق سے پیدا ہونے والے اختلافات کی نشاندہی نہیں کرنا چاہیے خواہ ان اختلافات سے قرأتِ متن کی قابلِ قبول صورتیں بھی سامنے آتی ہوں۔ مثلاً اگر ایسے کسی کاتب کے لکھے ہوئے نسخے میں "نگاہِ ناز" کی جگہ "نگاہِ یار" لکھا ہوا ملے تو بھی اس اختلاف کو نظر انداز کر دینا ہوگا اس لیے کہ ممکن ہے کاتب نے لفظ "ناز" ہی لکھا ہو جو اس کی بے احتیاطی کی وجہ سے "یار" پڑھا جا رہا ہو۔

کبھی کبھی سہوِ کتابت سے کوئی لفظ یا حرف یا نقطہ چھوٹ جاتا ہے، کوئی لفظ یا حرف مکرر ہو جاتا ہے یا نقطے کی جگہ بدل جاتی ہے۔ اس طرح بھی نسخوں میں، رسمی نوعیت کا سہی، اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کی نشاندہی ضروری نہیں بہ شرطے کہ اس قسم کی فروگذاشت کو صریحاً سہوِ کاتب پر محمول کیا جا سکے۔ مثلاً

"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو"

میں "سے" کی دو مرتبہ کتابت ہو جانا "سے" کا چھوٹ جانا اور "غرض" میں غ کا نقطہ زیر لگ جانا اور ض کا نقطہ رہ جانا۔ لیکن اگر اس طرح کے اختلاف سے متن کی کوئی اور قابلِ قبول صورت سامنے آتی ہو تو اس کو اختلافِ نسخ میں درج کرنا چاہیے۔ مثلاً "مرزبوم" اور "مرزبوم" کے اختلاف کی نشاندہی غیر ضروری ہے اس لیے کہ "مرزبوم" کوئی لفظ نہیں ہے، لیکن "ارزق" اور "ازرق" میں نقطے کا اختلاف ظاہر کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے، یا "میں نے ایک شخص کو دیکھا" اور "میں نے ایک شخص دیکھا" میں "کو" کے ہونے نہ ہونے کی نشاندہی ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ جملہ "کو" کے ساتھ بھی صحیح ہے اور اس کے بغیر بھی۔ یا مثلاً لفظ "لوں" کی جگہ "لو" لکھنا سہوِ کاتب ہو سکتا ہے لیکن چونکہ یہ لفظ نونِ غنہ کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کو اختلافِ نسخ میں اس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس طرح مثلاً "کیوں" میں نونِ غنہ کی کتابت نہ ہونے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً "تیز تلوار" کی جگہ اگر کسی نسخے میں "تیر تلوار" لکھا ہو تو "تلوار" کو صریحاً سہوِ کتابت ہونے کی بنا پر اختلافِ نسخ میں درج نہ ہونا چاہیے لیکن "تیز" کی جگہ "تیر" سے متن کی ایک اور قرینِ قیاس اور قابلِ قبول صورت سامنے آتی ہے، اس لیے اسے درج ہونا چاہیے۔

۴۔ پرانے شعری متون میں بعض کاتب کبھی کبھی مُردّف کلام کی ردیف کو چھوڑ دیتے تھے یا جزئی طور پر لکھتے تھے۔ مثلاً

"یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں   اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جام مے   یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ   جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو

اس اختلاف کی نشاندہی کرنے کے بجائے مصرعوں کے نہ لکھے ہوئے حصّوں کو لکھا ہوا مان لینا چاہیے اس لیے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس حصّے کی متنی عبارت کیا ہوگی۔ یہی اصول عبارت کے کرم خوردہ یا کسی اور سبب سے غائب شدہ حصّے پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اگر اس حصّے کی کسی دوسری قرأت کا امکان نہ ہو تو اختلافِ نسخ میں اس کی نشاندہی نہ ہونا چاہیے لیکن اگر یہ حصّہ قرأت کے لحاظ سے مختلف فیہ ہو سکتا ہے تو اختلافِ نسخ میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ فلاں نسخے میں یہ حصّہ غائب ہو گیا ہے۔

۵۔ مختلف نسخوں میں ایک صنف یا ایک مصنف کے اشعار کے اندراج سے پہلے "ایضاً" یا "ولہٗ" یا "ولہٗ ایضاً" کے الفاظ لکھ دیے جاتے ہیں، مصرعے یا شعر سے پہلے "ع" یا "ﻫ" کا نشان بنا دیا جاتا ہے، بزرگانِ دین کے ناموں پر "ص"، "رح"، "رض"، "ع" کے تعظیمی نشان، شاعروں کے تخلص پر بط (ﻣ) یا اسمائے خاص پر لکیر بنا دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کسی متن کے یہ نسخے اُسی متن کے اُن نسخوں سے مختلف ہو جاتے ہیں جن میں اس قسم کے التزامات نہیں ہوتے، لیکن ان اختلافات کی نشاندہی اختلافِ نسخ کے تحت نہیں ہونا چاہیے، البتہ اگر ضرورت ہو تو مقدمۂ مرتب میں اُن کا ذکر آ سکتا ہے۔

۶۔ بعض نسخوں کے متن میں غلط نقل ہو جانے والے لفظ پر کاتب یا مصحح کوئی نشان بنا کر صحیح لفظ حاشیے پر لکھ دیتا ہے، کبھی عبارتوں یا لفظوں کے موخر مقدم ہو جانے کی صورت میں اُن پر "خ" اور "م" کے نشان بنا کر اُن کی صحیح جگہ ظاہر کر دی جاتی ہے، کبھی اسی غرض سے بے جگہ عبارتوں یا لفظوں پر صحیح ترتیب کے لحاظ سے نمبر ڈال دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی شعر تین مختلف نسخوں میں مندرجۂ ذیل تین مختلف طریقوں سے لکھا ہوا مل سکتا ہے:

(نسخہ ۱) " موت کا ایک دن مقرر ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ٭ معیّن"
(نسخہ ۲) " ایک خ دن موت م کا معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"
(نسخہ ۳) " ۲ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی   ۱ موت کا ایک دن معیّن ہے"

لیکن اختلافِ نسخ میں نہ تو ان قرأتی اختلافات کی نشاندہی ہونا چاہیے، نہ ان کے تصحیحی اشاروں کی، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ان تصحیحی اشاروں کی رو سے شعر کی قرأت کیا ظاہر ہوتی ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ان اشاروں کے مطابق پہلے نسخے میں "مقرر" کی جگہ "معیّن" ہے، دوسرے نسخے میں "موت کا" پہلے اور "ایک دن" بعد میں ہے، اور تیسرے نسخے میں جس مصرعے پر نمبر ۱ پڑا ہے ("موت کا... الخ) وہ مصرعِ اولیٰ اور جس پر نمبر ۲ پڑا ہے ("نیند کیوں..." الخ) وہ مصرعِ ثانی ہے۔ اس طرح تینوں نسخوں کے لحاظ سے شعر کی قرأت ایک ہی ہے، یعنی

موت کا ایک دن معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لہٰذا اختلافِ نسخ کے تحت اس کا کوئی اندراج نہیں ہونا چاہیے۔

۷۔ لفظوں کے استعمال میں بعض کاتبوں کی بے احتیاطی اور یائے معروف و مجہول

میں فرق نہ کرنے کا ذکر کیا جا چکا ہے، اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کاتبوں کی اس روش سے پیدا ہونے والے اختلافات کی نشاندہی غیر ضروری ہے۔ یہ نشاندہی صرف اُس وقت غیر ضروری ہے جب زیر تدوین متن کے کچھ ایسے نسخے یا کم از کم ایک ایسا نسخہ مرتب کے پیشِ نظر ہو جس میں نقطوں کی احتیاط یا یاے معروف و مجہول کے امتیاز کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور اُس نسخے (یا نسخوں) کی قراتوں پر اعتبار کیا جا سکتا ہو۔ لیکن

(الف) اگر متن منحصر بہ فرد نسخے پر مبنی ہو اور اس کے کاتب نے، یا

(ب) متن کے جتنے نسخے دستیاب ہوں ان میں سے کسی کے بھی کاتب نے اس احتیاط یا امتیاز کو ملحوظ نہ رکھا ہو تو ہمیں اختلافِ نسخ کا یہ اصول بدلنا ہوگا، یا

(ج) اگر متن کے دستیاب نسخوں میں خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ شامل ہو (خواہ اس کو اساسی نسخہ نہ بنایا گیا ہو) اور اس نسخے سے، یا

(د) کسی اور باوثوق ذریعے سے یہ ثابت ہو جائے کہ مصنف نقطوں یا یاے معروف و مجہول کی کتابت میں احتیاط یا فرق نہیں کرتا تھا تو اُس کے دست نویس نسخے کے ساتھ ساتھ اس کی تحریروں کی نقلوں کی قرأت بھی مختلف فیہ ہو جائے گی اور اس صورت میں بھی ہمیں زیرِ بحث اصول بدلنا ہوگا۔ "نگاہِ ناز" اور "نگاہِ یار" کی مثال پیش کی جا چکی ہے کہ اگر غیر محتاط کاتب کے نسخے میں "ناز" کی جگہ "یار" لکھا ہوا ہو تو اس کی نشاندہی ضروری نہیں، لیکن مذکورہ بالا استثنائی صورتوں میں مرتب کو چاہیے کہ اپنی اختیار کی ہوئی قرأت کو متن میں جگہ دینے کے ساتھ اختلافِ نسخ کے تحت وضاحت کرے کہ اس متن کی دوسری امکانی قرأت یا قرأتیں کیا ہو سکتی ہیں، یعنی اگر وہ "نگاہِ ناز" کی قرأت کو اختیار کرتا ہے تو اسے اختلافِ نسخ میں "نگاہِ یار" کی قرأت بھی درج کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر مرتب کے پیشِ نظر متن کا کوئی ایسا معتبر نسخہ نہیں ہے جس میں یاے معروف و مجہول کے مابین امتیاز کیا گیا ہو تو بھی اسے اختلافِ نسخ میں یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، مثلاً اس عدم امتیاز کی وجہ سے ایک فقرے کی مندرجۂ ذیل چار قرأتیں ممکن ہیں:

۱۔ یمن کی شہزادی نے دمشق کی شہزادی سے کہا۔

۲۔ یمن کی شہزادی نے دمشق کے شہزادے سے کہا۔

۳۔ یمن کے شہزادے نے دمشق کے شہزادے سے کہا۔

۴۔ یمن کے شہزادے نے دمشق کی شہزادی سے کہا۔

ایسی صورت میں مرتب کو چاہیے کہ ان میں سے کوئی ایک قرأت متن میں دے اور بقیہ کی نشاندہی اختلافِ نسخ کے تحت کرے۔

اختلافِ نُسخ کی نشاندہی کا اصل مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جس متن کی تدوین کی گئی ہے اس کی قرأت اور ترتیب مختلف نسخوں میں کیا ہے، اور اس نشاندہی کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ مثلاً اگر متن کی تدوین میں پانچ نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے تو اختلاف نسخ کی مدد سے ان پانچوں نسخوں کی علیحدہ علیحدہ اور مطابقِ اصل نقلیں تیار کی جا سکیں، لیکن جیسا کہ ابھی تک کی گفتگو سے ظاہر ہے، یہ نقلیں صرف قرأت و ترتیبِ متن کے لحاظ سے مطابقِ اصل ہوں گی، ہر املائی اور کتابتی اختلاف اور کاتب یا مصحح کی ہر فرو گذاشت کی نمائندگی کے لحاظ سے بھی ان کا مطابقِ اصل ہونا ضروری نہیں، البتہ اگر مرتب کسی منحصر بہ فرد نسخے کی تدوین کر رہا ہو یا زیرِ تدوین متن دو ہی تین نسخوں پر مبنی ہو تو وہ اختلافِ نسخ میں اس نوعیت کے سب یا کچھ اختلافات کی بھی نشاندہی کر سکتا ہے بہ شرطے کہ اس کے نزدیک اس نشاندہی کی کوئی اہمیت یا جواز ہو۔

آخر میں اختلافِ نسخ کی نشاندہی کے طریقوں کا بھی کچھ ذکر ضروری ہے۔ اردو اور فارسی کے متون میں اس نشاندہی کے تین طریقے ملتے ہیں :

۱۔ اختلافی قرأت پر "ن" (نسخہ بدل) کا نشان بنا کر اس کے قریب ہی داہنے یا بائیں حاشیے پر یا بین السطور میں یہی "ن" کا نشان بنا کر دوسری قرأت لکھ دینا۔ یہ طریقہ پہلے اختیار کیا جاتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتا ہے، لیکن اگر نسخی اختلافات کی تعداد زیادہ ہو اور ان کی نشاندہی کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہو (اور اصولِ تدوین کے لحاظ سے ضروری ہے) کہ کون اختلاف متن کے کس نسخے یا کن کن نسخوں میں ہے تو یہ طریقہ مناسب اور قابلِ عمل نہیں رہتا۔

۲۔ اختلافی قرأت پر حاشیے کا نمبر ڈال کر متن کے اسی صفحے کے پاورقی حاشیے میں اسی نمبر کے تحت مختلف نسخوں کے حوالے سے اختلاف کی نشاندہی کرنا۔ یہ طریقہ زیادہ مستعمل رہا ہے۔ اس میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ اختلافات کی نشاندہی صفحہ بہ صفحہ اور متن کے قریب ہی ہوتی چلتی ہے اور پڑھنے والے کو ان کی تلاش میں زیادہ زحمت نہیں ہوتی۔ لیکن اس طریقے

میں دو قباحتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اختلافات کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے الگ الگ صفحوں میں حاشیوں کا حصّہ گھٹتا بڑھتا اور اسی تناسب سے متن کا حصّہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس سے کتاب میں ایک طرح کی بدنما ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ متن ہی کے صفحے پر نسخی اختلافات کی تفصیل درج ہونے سے پڑھنے والے کی نگاہ اور توجّہ بھٹکتی ہے اور اس کے لیے یکسوئی کے ساتھ متن کا مطالعہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یہ طریقہ دھیرے دھیرے متروک ہوتا جا رہا ہے۔

۳۔ تیسرا طریقہ، جو اب زیادہ رواج پا رہا ہے، یہ ہے کہ صفحہ بہ صفحہ حاشیے پر نشاندہی کے بجائے سارے اختلافات متن کے ختم ہو جانے کے بعد یک جائی صورت میں تسلسل کے ساتھ درج کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح متن کا تسلسل مجروح نہیں ہوتا اور اسے یکسوئی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ اس طریقِ کار پر کبھی کبھی یہ اعتراض سننے میں آتا ہے کہ اس میں اختلافِ نسخ متن سے بہت دور جا پڑتے ہیں اور ان کی تلاش میں بار بار کتاب کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے جو زحمت طلب کام ہے۔ یہ بات درست ہے، لیکن کسی متن کا تحقیقی مطالعہ کرنے والے سے اتنی زحمت کشی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

جامع
انگریزی۔اردو لغت
جلد اوّل تا ششم

مدیر اعلی
کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اُردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر اُردو الفاظ فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروّج علوم و فنون سے متعلق انگریزی/اُردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کلاں کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اُردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ....

☆ دو سو سے زائد سائنسی و سماجی علوم و فنون پر محیط ....

☆ امریکی/برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ ....

☆ قومی اُردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ .... ایک تاریخی دستاویز

بڑا سائز ۹×۵ء۱۱۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت .... کمپیوٹر شدہ کتابت

مضبوط و مطلّا جلد .... صفحات: جلد اوّل (۱۲۱۷، قیمت ۴۰۰)، جلد دوم (۱۰۶۲، قیمت ۶۰۰)، جلد سوم (۱۰۹۱، قیمت ۶۰۰)، جلد چہارم (۸۶۶، قیمت ۶۰۰)، جلد پنجم (۱۰۴۲، قیمت ۶۰۰)، جلد ششم (۱۰۱۳، قیمت ۶۰۰)

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت۔

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔۱، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔006 110

فون : 6179657 ,6103938 ,6103381 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

انصار اللہ

عمل تدوین اور تدوین متون

اردو میں قدیم متون کو نئی ترتیبوں سے آراستہ کر کے شائع کر دینے کا چلن اگرچہ عام ہو چکا ہے، ابھی تک اس کام کی منہاج متعین نہیں ہو سکی ہے۔ ذہنوں میں اس کا بہت واضح اور غیر مبہم تصور بھی موجود نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے کارنامے کم ہی سامنے آسکے ہیں جن کو مثالی اور معیاری کہا جا سکے۔

عام طور سے تدوین کے سلسلے کے کاموں کے لیے "ترتیب" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور جو کچھ کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ متن کو اِس طور پر پیش کر دیا جائے کہ وہ ہمارے نظریات بلکہ مفروضات و قیاسات کے مطابق صحیح اور ان کا موید ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کام کو "ترتیب" سے زیادہ کچھ کہلانے کا حق بھی نہیں ہو سکتا۔ اِن کاموں سے ایک عام قاری کی شاید تشفی ہو سکے لیکن اہل تحقیق کے لیے یہ صورت نہ صرف ناقابل اعتماد بلکہ بعض اعتبار سے گمراہ کن بھی رہی ہے۔ اس سے کبھی تاریخی امور کی ترتیب میں خلل واقع ہوتا ہے اور کبھی حقائق و واقعات تک رسائی میں الجھن اور دقت پیدا ہوتی ہے۔ اس طور سے مرتب کردہ متون کی بنیاد پر اگر کوئی لغت مرتب کرنا چاہیں تو بڑی مایوسی ہو گی کیونکہ ان میں نہ قدیم تلفظ ملے گا اور نہ اس عہد کا املا ہوگا۔ اسی طرح قدیم متون کی اِن جدید ترتیبوں پر لسانیاتی تجزیوں کے لیے بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہاں فیصلے تلفظ اور املا کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ قواعد کا بھی کم و بیش ایسا ہی حال ہے۔ اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) مطبوعہ کدم راو پدم راو میں صفحہ ،، پر یہ مصرع ہے۔

ع غلوے گرے جیوں تفنگ سدہ نہ

مخطوطہ میں صریحاً لفظ "تفک" لکھا ہوا ہے۔ اور یہ اس کلمہ کی قدیم صورت ہے۔ "تفنگ" کا چلن بعد میں ہوا تھا۔ مدوّن کے لیے دونوں صورتوں میں فرق کرنا ضروری تھا۔

(ب) بیجاپوری شاعر عبدل کے "ابراہیم نامہ" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں) صفحہ ۱۱۴ پر ایک شعر اس طرح لکھا ہے ؎

توعبدل کیتی صفت کرشہ بیاں رہی ہے سو بھر کر زمیں آسماں

بصورت موجودہ شعر کے دونوں مصرعے بے معنیٰ ہیں۔ صحیح شعر اس طرح ہوگا ؎

توعبدل کیتئیٔ صفت شہ کر بیاں رہیئے سو بھر کر زمیں آسماں

مخطوطہ میں اگر کوئی لفظ ادھر اُدھر ہو گیا ہے تو متن کے مفہوم پر غور و فکر کر کے اس کی تصحیح کر دینا مدوّن کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح رسمِ تحریر کے فرق اور مصنف کی زبان سے بخوبی واقف ہونا بھی اس کے لیے ضروری ہے، چنانچہ "کیتی" ، کیتئی (کتنی ہی) ہے۔ "صفت کرشہ" میں بدیہی طور پر ترتیب بدل گئی ہے۔ دوسرے مصرع میں "رہیئے" (= رَہِ یئے = رہ جائیگی) سے مرتب نا آشنا تھا اس لیے اس نے "رہی ہے" (رہ گئی ہے یا رہی تھی) بنا دیا۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے متون جو تلفظ، املا اور عبارت پر کما حقہٗ غور و خوض کے بغیر مرتب کیے گیے ہوں ناقص اور نتیجے کے طور پر گمراہ کن ہوں گے اور بد قسمتی سے اردو میں عموماً اسی طور پر کام کیے جا رہے ہیں۔ غالباً یہ بھی ایک سبب ہے کہ اکثر اہلِ علم تدوین کے کام کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں۔

کیفیت یہ ہے کہ اتفاق سے کسی کے ہاتھ کوئی نادر یا کمیاب نسخہ لگ جائے تو وہ اس "دریافت" کی بدولت خود کو محققین میں شمار کرنے لگتا ہے۔ محض دریافت کو اتنی اہمیت دینا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہم مسائل اور نکات تک رسائی حاصل کرنے میں عاجز ہیں۔ مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے بزرگوں کی دردمندی اور اُن

کے کارناموں کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو میں تدوین (EDITING) کے نام پر جو ہو رہا ہے بیشتر ناقص اور اس عمل کی مسخ شدہ صورت ہے۔

متن کی قرات کے لیے بڑی محنت اور دقتِ نظر بلکہ مسلسل غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حافظ محمود خاں شیرانی نے ایک قدیم فقرہ اس طرح نقل کیا تھا:

"برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا"

اور ایک تفصیلی بحث کے بعد یہ حکم لگایا تھا کہ کلمہ "تھا" ملتانی زبان کے مصدر[3] "تھیونا" کے ماضی "تھیا" کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ شیرانی صاحب علم صاحب نظر تھے۔ وہ اپنی اس بحث پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہے۔ کچھ مدت کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ فقرۂ مذکور کی قرات اس طرح صحیح ہوگی:

"برکت شیخ پٹھا، اک موا اک نٹھا"

اور اس طرح "تھا" سے متعلق ان کی سابقہ پوری بحث خود بخود کالعدم ہو گئی۔ انھوں نے اعتراف کیا یہ "ہندی[4] جملہ" ہے۔ پنجابی، ملتانی یا سندھی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں جناب نور احمد خاں آفریدی نے اس جملہ کی تصحیح اس طرح کی:

"بحرمتِ پیر پٹھا اک مویا اک نٹھا"

یعنی حضرت پیر پٹھا کے طفیل اک (محمد تغلق) مر گیا اور اک (فیروز شاہ) محاصرہ اٹھا کر واپس چلا گیا۔ اس مثال سے اندازہ کیا جانا چاہیے کہ متن کی صحیح قرات کر لینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا عام طور سے سمجھ لیا گیا ہے۔ واقعی صحیح صورت تک پہنچنے کے لیے بڑی کاوش اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

EDITING جس کے لیے ترتیب کے بجائے تدوین[5] کی اصطلاح مناسب تر ہے، ایک بسیط فن ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں یہ گنجائش بھی موجود ہے کہ "بقدر شوق" اس کی وسعتوں میں اضافے بھی ہو سکیں۔ اس فن کی حدوں کا تعین کرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت ہے۔ تدوین خالصتاً عملی فن ہے۔ اس

کے برتنے، دیکھنے یا سمجھنے کے لیے بھی مناسب نگاہ اور ذہن کی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کا انحصار کام کی نوعیت اور اس سلسلے میں کی جانے والی کاوش پر ہے۔ تدوین کے کسی بھی کام سے متعلق نہ اس نوعیت کا خاکہ (SYNOPSIS) تیار کیا جا سکتا ہے، نہ اِس سلسلے میں اس قسم کے ابواب اور عنوانات قائم کرنے ممکن ہیں جو تنقیدی یا دوسرے بیانیہ مقالوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اِس عمل (تدوین) کے کچھ درجے یا شعبے البتہ ہوتے ہیں۔

تدوین کے لیے علم کی بصیرت کے ساتھ ساتھ، ذہن کی شائستگی، مزاج کا اعتدال اور طبیعت کا استقلال بھی لازم ہے۔ مدوّن کو اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ نہ صرف ناقد ہے، نہ محض محقق ہے اور نہ فقط شارح یا مفسّر بلکہ اسے بیک وقت ان سب کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُس پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ کسی متن کا مفہوم بیان کرے لیکن مفہوم کو پوری طرح کے ساتھ ذہن نشین کر لینا لازم ہے کہ اِس کے بغیر تدوین کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ مدوّن کے لیے ادبی یا لسانی مورخ کی طرح لفظوں کے تلفظ اور املا کے عہد بہ عہد ارتقا سے واقفیت ضروری نہیں ہے لیکن یہ جاننا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ جس مصنف کی تحریر کو وہ مدوّن کرنا چاہتا ہے تلفظ اور املا سے متعلق اُس کا مسلک کیا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کاتب نے مصنف کی تحریر میں کس کس انداز سے اور کس حد تک تحریف، تصرف یا تصحیح کی ہے اور اس سے متن پر کس نوعیت کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسی طرح ناقد کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی بھی علمی شہپارے کا تجزیہ کر کے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ مدوّن اگرچہ عملاً تجزیہ نہیں کرتا لیکن متن کے ہر جُز کی کیفیت و کمیت سے بخوبی واقفیت کے بغیر اس کا کام نہیں چل سکتا مثلاً شیخ محمد ابراہیم ذوق کا ایک شعر اس طرح رائج ہے ؎

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم ۔۔۔ جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

مدوّن کی نگاہ اس پر پڑی تو اس کی تنقیدی بصیرت نے اسے فوراً متنبہ کیا کہ ذوق جیسا شاعر یہ رخسارہ کیوں نظم کرے گا؟ پھر اس نے غور کیا کہ اگر کوئی تُرک

خطائی نگیں ہو تو یہ شعر بے معنی ہو جائے گا۔ اب اس کا علم و مطالعہ متن کی صحیح صورت کی طرف اس کی رہبری کرے گا یعنی ؎

رخسارِ گل آتیں کا ہے سرخی سے یہ عالم　　　جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

اس طرح شعر کا متن درست ہو گیا اور اس کے عیوب دور ہو گئے۔

تدوین کے کام کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ ناقد ہو یا مورخ، مفسر و شارح ہو یا محقق سب کسی نہ کسی درجے میں سابقین کی فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جب کہ مدوّن اپنے عمل میں بہت حد تک آزاد ہوتا ہے۔ فکر و عمل کی آزادی اسی صورت میں ممکن ہے جب مدوّن کو اپنے علم اپنی استعداد، اپنی بصیرت اور اپنی طبیعت کی سلامتی پر پورا اعتماد ہو۔ یہ اعتماد اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ، تحقیق وغیرہ کے لیے بنیادی مواد کی فراہمی کا کام مدوّن ہی کی ذمہ داری ہے۔ اسے اکثر تاریخ ساز اور انقلاب آفریں نکات بھی پیش کرنے ہوتے ہیں۔ جس شخص میں خود اعتمادی کا وصف نہ ہو وہ ایسے نتائج تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور بفرضِ محال اگر ان تک پہنچ جائے تو ان کو پیش کرنے کی جرأت کہاں سے لائے گا؟

تدوین کے عمل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے چھ مدارج طے کرنے ہوتے ہیں۔ ان مدارج کے لیے "شعبہ" کی اصطلاح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ تدوین کے یہ چھ شعبہ اس طرح ہیں:

۱۔ فراہمیِ متن	۲۔ ترتیبِ متن	۳۔ تصحیحِ متن
۴۔ تحقیقِ متن	۵۔ تنقیدِ متن	۶۔ توضیحِ متن یا تحشیہ

مقدمہ ان کے علاوہ ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر چار بنیادی اہمیت کے حامل ہیں یعنی اگر ان چار مدارج تک کام کو پہنچا دیا جائے تو اصولاً تدوین کا کام پورا ہو گیا۔ آخری دو شعبے اس کام کی "تحسین" (APPRECIATION) کے ہیں۔ اگرچہ ان کی بھی اہمیت ہے لیکن یہ براہِ راست عملِ تدوین کا جز نہیں ہیں، صرف معاون کے درجے میں ہیں۔ ان شعبوں کے تقاضے مختلف ہیں اور ہر ایک کے مسائل بھی الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے طریقۂ کار بھی جداگانہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہر شخص ہر قسم کی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوتا ہے۔ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہر شعبے کے تقاضوں کو مساوی طور پر پورا کرنا ہر شخص کے لیے

عملاً ممکن نہیں اس لیے مختلف کاموں کو پرکھتے وقت گنجائش ضرور رکھنی چاہیئے۔

اس نہج پر یہ ذکر ضروری ہو جاتا ہے کہ راقم کے عندیہ میں متن سے وہ بنیادی چیز مراد ہے، جس کو اس کی اصل کے تقاضوں کی روشنی میں صحت اور اہتمام کے ساتھ اس مقصد سے پیش کیا جائے کہ اس کے نتیجہ میں حقیقت تک رسائی ممکن ہو سکے۔ اس تعریف کی رو سے مختلف علوم کے دائرہ میں مختلف چیزیں متن کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں چنانچہ علم کیمیا کی تجربہ گاہ میں زیر مطالعہ کیمیاوی مادہ، علم اصوات کے لیے بعض مخصوص اور متعین آوازیں متن میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح تواریخ کے طالب علم کے لیے واقعات، ادب کا مطالعہ کرنے والے کے لیے نظم و نثر کی تحریریں علم ہجا اور علم لسان کے سلسلے میں زبان کے فقروں اور کلموں کو متن خیال کیا جائے گا۔

کوئی بھی متن دو صورتوں میں دستیاب ہو سکتا ہے یعنی (الف) واضح اور متعین صورت میں، اور (ب) منتشر اور غیر متعین حالت میں۔ دونوں صورتوں میں اسے حاصل کر کے اپنے مطالعے کے قابل بنا لینا مدوّن کی ذمہ داری ہے۔ متن کا حصول ہی تدوین کا پہلا درجہ ہے جسے "فراہمی متن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ادب اور زبان کے لیے متن ایک جملہ، ایک فقرہ بلکہ ایک کلمہ اور کبھی محض ایک آواز کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کتابوں کی کئی جلدوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ اب یہ مدوّن کا معاملہ ہے کہ وہ پوری کتاب، رسالے یا بیاض کی تدوین کرے یا اس کے کسی بڑے یا چھوٹے جزو کو اس کام کے لیے انتخاب کرے۔ اسی طرح اُسے اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ زیرِ تدوین متن میں کسی دوسرے مآخذ سے دستیاب شدہ متن کو بھی شامل کر لے۔

متن منتشر حالت میں بھی ہو سکتا ہے مثلاً کسی شاعر کا کلام جو مختلف بیاضوں سے اخذ کیا جائے یا جو مختلف لوگوں سے سُن کر جمع کر لیا جائے۔ اسی طرح کسی بزرگ کے اقوال جو عقیدت مندوں کو یاد ہوں اور انھوں نے بطور یادداشت کہیں لکھ لیے ہوں یا سینہ بہ سینہ روایت کی صورت میں لوگوں کے حافظوں میں محفوظ ہوں۔ اس طرح یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ متن تحریری شکل میں ہو۔

وہ سینہ بہ سینہ روایتوں کی صورت میں زبانی بھی ہو سکتا ہے اور آج کے دور میں کیسیٹ میں بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ زبانی نقل والے متن کی ثقاہت کے تعین کے لیے راوی کے معاملات اور معمولات کو پرکھنا ہوگا۔

عام خیال ہے کہ متن بامعنی ہوتا ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن برعکس صورت بھی ممکن ہے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد ناقل ہیں کہ شیخ ناسخ نے "چند بے معنی غزلیں بنا رکھی تھیں" ان بے معنی غزلوں کو بھی متن کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ بامعنی یا بے معنی ہونا محض اضافی بات ہے۔ ایک شخص جس بات کو نہیں سمجھتا اس کے لیے وہ بات بے معنی ہے خواہ وہ اسی کی زبان میں ہو یا کسی غیر زبان میں ہو۔ ایسے مقامات پر مدوّن کو چاہیئے کہ اُس بے معنی متن کو بحدِ امکان صحت کے ساتھ بجنسہٖ نقل کر کے صورتِ حال کی نشاندہی حاشیہ پر کر دے۔

جو متن تحریری صورت میں ہے، کتابت کے اعتبار سے اُس کی ثقاہت اور صحت کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً (الف) وہ مصنّف کا مسودہ ہے یا متن کی وہ شکل ہے جو مصنّف نے خود اپنے ہاتھ سے صاف کر کے لکھی ہے (ب) کسی قریب العہد کاتب نے لکھی ہے اور مصنف نے اس کی تصحیح کی ہے یا کاتب کوئی ایسا شخص ہے جو مصنف کے مسلکِ تحریر سے بخوبی واقف ہے اور متن کو اس نے اہتمام کے ساتھ اسی کے مطابق لکھا ہے (ج) کسی خوشنویس، خوش مذاق اور صاحبِ علم شخص نے اس کی کتابت کی ہے یا (د) کاتب بے احتیاط بھی ہے اور بدخط بھی ہے۔

عموماً مصنّف کی تحریر کو مستند خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ مصنّف بھی آدمی ہوتا ہے اور سہو و خطا سے کوئی بشر پاک نہیں ہے۔ تحریر میں کوئی کلمہ یا فقرہ چھوٹ سکتا ہے۔ سہواً غلط لکھا جا سکتا ہے۔ کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف نے کسی غلط کو ہی صحیح سمجھ کر لکھا ہو۔ پہلی دو صورتوں کی تصحیح کر کے ان کی نشاندہی کر دی جائے گی لیکن آخری صورت کے

بارے میں وضاحت کی جائے گی کہ مصنف اس غلطی میں مبتلا تھا۔ مصنف کی تحریر کے بارے میں کوئی حکم لگاتے وقت اس کے سن و سال، اور احوال پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ ابتدائی عمر کی تحریر زمانۂ شیب کی تحریروں سے مختلف ہو سکتی ہیں، محض شانِ خط کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ معانی، مطالب اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بھی مثال کے طور پر میر علی اوسط رشک کا دیوانِ ثانی ۱۲۶۱ھ میں مکمل ہوگیا۔ اس میں ایک شعر اس طرح تھا ؎

جس نے منعم کو کیا منعم اسے کہتی نہیں　　مانگنا بندے سے ہے بیجا، خدا سے مانگیے

صرف دو برس کی مدت میں یعنی ۱۲۶۳ھ تک میر صاحب کے خیالوں میں فرق پیدا ہوچکا تھا اور وہ لفظ "کہتی" کو واجب الترک قرار دے رہے تھے۔ اس شعر کے پہلے مصرع کو انھوں نے اس طرح بنا دیا:

ع　جس نے منعم کو کیا منعم کی اُس کو نہیں

اب اگر ان کے دیوان کو اس دعوے کے ساتھ مرتب کیا جائے کہ یہ ۱۲۶۱ھ میں مکمل ہوچکا تھا تو متن میں پہلی صورت اختیار کی جائے گی، باوجود اس سے کہ یہ حقیقت ہم پر واضح ہے کہ وہ صورت ترمیم طلب تھی اور بعد میں شاعر نے خود تبدیلی کر لی تھی۔ سبب یہ ہے کہ اصلاح شدہ صورت اس زمانے تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جب ہم (BEST TEXT) "بہترین"، یا منتخب متن کا ذکر تدوین کی اصطلاح کے طور پر کرتے ہیں تو اس سے لازماً متن کی بہترین صورت مراد نہیں ہوتی بلکہ متن کی وہ صورت مطلوب ہوتی ہے جو مخصوص زمانے اور حالات میں وجود میں آسکتا تھا۔ اس پر زمانۂ مابعد کی خود مصنف کی اصلاح بھی قابلِ قبول نہ ہوگی۔ اس کے استاد یا متن کے کاتب یا مدوّن کی تصحیح یا ترمیم کے قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فراہمی متن کے سلسلے میں کوشش اِس بات کی بھی ہونی چاہیئے کہ مصنف کا تلفظ اور املا بھی محفوظ ہو جائے۔ تلفظ اور املا سے مصنف کے مبلغِ علم ہی کا پتا نہیں چلتا ہے بلکہ کبھی کبھی اِن کی تواریخی اہمیت بھی ہوتی ہے اور ان سے بعض بڑے اہم نتائج کا استخراج بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ کی تحریر اگر مل جائے تو یہ کام

نسبتاً آسان ہوجاتا ہے ورنہ متن کے بغور مطالعے سے بھی کسی نہ کسی حد تک حقیقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مصنف اور کاتب کے درمیان جو زمانی یا مکانی یا ذہنی بُعد ہوتا ہے کبھی کبھی وہ بھی بڑی اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور بڑے دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے، اسی لیے مدوّن کو چاہیے کہ مصنف کے ساتھ ساتھ کاتب کے حالات سے بھی کم و بیش واقفیت کی کوشش ضرور کرے۔ اگر دونوں کے زمانے اور مقام کا پتا چل جائے تو اِس بُعد کی وجہ سے املا یا تلفظ میں پیدا ہوجانے والے فرق کی نشاندہی کر دینا بھی مناسب ہے۔ اِس سے بعض ایسی صورتیں سامنے آنے کا امکان ہے جو آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید بلکہ راہنما ہوسکتی ہیں۔

اردو میں تحریر اور تقریر کے امتیازات کو عموماً کما حقہٗ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ اہل ترتیب کی پسندیدہ روش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ متن کو اپنے زمانے کے مروّجہ املا اور تلفظ کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ بظاہر اُن کا یہ اقدام اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ عام قاری کو اِس متن کا پڑھ لینا آسان ہوجاتا ہے لیکن غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اِس تبدیلی کے نتیجہ میں املا اور تلفظ کس حد تک مسخ ہوجاتا ہے۔ علمِ تحریر کے نقطۂ نظر سے اصل تحریر جن فوائد کی حامل تھی ان سے یہ نیا تبدیل شدہ متن محروم ہوتا ہے۔ یہ تازہ متن مصنف، مرتب اور کاتب کی تحریری خصوصیات کا مرکب بن جاتا ہے۔

قدیم متون کے مطالعہ کے سلسلے میں مختلف مقامی بولیوں کے امتیازات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اردو میں اعراب بنانے کا التزام عموماً نہیں کیا گیا ہے۔ ایک ہی لفظ کو کئی طرح سے پڑھا جاسکتا ہے مثال کے طور پر بابر کی فتحیابی سے متعلق ایک شعر اس طرح لکھا گیا ہے ؎

اٹھیں رجب سکر بارا بابر جیتا براہیم ہارا

اِس میں پہلا لفظ "اٹھین" (بہ ضمۂ اول و اعلان نون) غلط ہے۔ یہ "اٹھیں" (بہ فتحتین) ہے یعنی آٹھویں۔ قرأت کی یہ غلطی اس بولی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہوئی۔

متن کی قرأت کا تعین ہوجانے کے بعد، متن کو صحیح ترین صورت میں قلمبند

کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ اصل کے املا اور تلفظ کی خصوصیات کا اظہار کر دیا جائے۔ بعض باتیں جو حوض میں ظاہر نہیں کی جا سکتیں حاشیہ پر تفصیل سے بیان کی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگوں کو خیال ہے کہ اگر جدید ترتیبوں میں بھی املا کی قدیم روش کو برتا گیا تو ان جدید ترتیبوں کی افادیت مجروح ہو گی اور ان کی قرأت بھی اتنی ہی دقّت طلب ہو گی جتنی قدیم مخطوطات کی۔ یہ اعتراض محض سطحی ہے اور اس سے تدوین کے مقصد سے بھی معترض کی عدم واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اصولاً قدیم متن سے خاطر خواہ استفادہ کے لیے اس کے عہد اور مقام کے املا اور تلفظ سے واقفیت ضروری ہے اور جو واقف ہے اسے قرأت میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ تدوین کا عمل کسی تجربہ گاہ کے لیے مفردات اور مرکبات کی فراہمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عوام کے لیے جس طرح یہ مفردات اور مرکبات غیر دلچسپ ہوتے ہیں اسی طرح تدوین کا عمل بھی ان کے لیے کوئی کشش نہیں رکھے گا۔ جس طرح کوئی فنکار اپنے فن کی داد صرف ”اہل نظر“ سے چاہتا ہے اہلِ تدوین کی دقّت، ان کی کاوش اور ان کی جگر سوزی کی قدر بھی صاحب نظر ہی کر سکتا ہے۔ تحسین ناشناس سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ کسی کام کو آراستہ کر کے پیش کرنا کسی شخص کے ذاتی سلیقہ پر منحصر ہے اور ؎

جو ہرِ خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب ‏ ‏ خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھہرا گوہر

مدوّن بھی اپنے کام کو اپنی ضرورت، پسند اور سلیقے کے مطابق آراستہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ متن کو اگر وہ اپنے عہد کے املا اور تلفظ کے مطابق پیش کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کا مجاز ہے بشرطیکہ کام کی نوعیت مانع نہ ہو اور مقدمہ یا کسی دوسری جگہ صراحت کر دی جائے۔

فراہمی متن کے جن مسائل کا یہاں تک بیان کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق اس صورتِ حال سے ہے جب کوئی مکمل تصنیف یا تالیف زیرِ تدوین ہو اگر متن منتشر حالت میں ہو تو چند مسائل اور بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی اور جیسا بھی متن، جہاں سے بھی دستیاب ہو سکے فراہم کر لیا جائے بغیر یہ خیال کیے ہوئے کہ وہ معتبر ہے یا نامعتبر۔ یہ اس لیے کہ

ابتدائی منزل پر امتیاز کر لینا عملاً ممکن نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی تجربے کی بات ہے کہ کبھی کبھی غیر معتبر متون سے بھی بڑے مفید اور بعض وقت نہایت اہم نتائج تک پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بھی یہ بات بجائے خود مفید ہے کہ کسی نامعتبر ماخذ کی بابت بالآخر قطعی طور پر یہ طے کر دیا جائے کہ وہ نامعتبر ہے۔ اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو مختلف النوع دشواریوں سے نجات ملے گی۔

یہ مسئلہ بھی کہ کسی متن تک رسائی کی صورت کیا ہو، بہت اہم ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی اصول یا قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی اتفاقات اور حادثات بھی اس معاملے میں معاون ہو جاتے ہیں۔

متن کی فراہمی کے بعد اس کی ترتیب کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ متن اگر کوئی مربوط نظم یا نثری کتاب ہے تو بھی بعض وقت ترتیب کا کام مدوّن کے لیے باقی رہ سکتا ہے یعنی وہ متن کو اپنے نقطۂ نظر سے مفید سے مفید تر بنانے کے لیے اصل ترتیب میں ردّ و بدل کا حق رکھتا ہے لیکن تبدیلی کا حق اُسے اِسی حد تک حاصل ہے کہ اِس سے مصنّف کے مقصود، معنی اور مطالب کی پیشکش میں بہ شمولِ تلفظ وغیرہ کوئی فرق واقع نہ ہو اور اِس تبدیلی سے متن کے مطالعہ میں بہتری اور سہولت کی صورت بھی پیدا ہو۔ دیوان، لغت اور تذکرے کی قبیل کی کتابوں میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اُن اصولوں کا جن کے پیشِ نظر جدید ترتیب قائم کی جا رہی ہے اور قدیم ترتیب کو قابلِ ترمیم یا لائق اصلاح خیال کیا گیا ہے مقدمہ میں بیان کر دینا ضروری ہے، تاکہ کسی نوعیت کا ابہام یا اشکال باقی نہ رہے۔ ترتیب میں ترمیم کی مثال کے لیے محسن کے تذکرہ "سراپا سخن" کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں ایک ہی شاعر کا حال ایک دو لفظوں کے فرق کے ساتھ بار بار آیا ہے۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ ایک شاعر کے بارے میں مختلف مقاموں پر جو کچھ لکھا ہے، واضح اشاروں کے ساتھ اسے ایک جگہ لکھ دے۔ اس طرح اِس تذکرے کی ایک ایسی ترتیب تیار ہو جائے گی جو تکرار کے عیب سے خالی ہونے کی وجہ سے مفید تر ہو گی۔

متن اگر منتشر حالت میں ہو اور اسے یکجا کرنا ہو تو اس کی ترتیب موضوع اور مطالب کی نوعیت کی مناسبت سے قائم کی جائے گی۔ ملفوظات کی ترتیب کا انداز دیوان

کی ترتیب سے مختلف ہوگا۔ اسی طرح تذکرے اور لغت کی ترتیب میں فرق ہوگا۔

ترتیب کبھی بہ لحاظ حروفِ تہجی قائم کی جاتی ہے، کبھی بہ اعتبارِ ردیف اور کبھی موضوع اور مباحث کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ کبھی زمانہ اور کبھی مضامین کی نوعیت کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ معاملہ پورے طور پر مدوّن کی صوابدید، منشا اور اس کے مزاج پر منحصر ہے۔ اصولاً افادیت کو بہر طور ملحوظ رکھنا چاہیے۔

رواج عام یہ ہے کہ اگر ایک متن کے دو نسخے مل جائیں تو ایک کو بنیادی خیال کر کے اُسے مِن وعَن نقل کر لیتے ہیں اور پھر دوسرے سے مقابلہ کر کے حاشیہ پر اختلافات کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ یہ طریقۂ کار نہایت سادہ اور آسان ہے کوئی بھی شخص جو متعلق تحریروں کو پڑھ لینے کی اہلیت رکھتا ہے اس طریقہ کے مطابق متن کو مرتب کر سکتا ہے۔ اس کے لیے علم یا تنقیدی شعور کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے نقل نویس کا کام ہے۔ لیکن اس طریقۂ کار سے تدوین کے تقاضے کما حقہٗ پورے نہیں ہوتے۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جسے اصطلاح میں بہترین (منتخب) متن کا طریقہ (BEST TEXT METHOD) کہتے ہیں۔ اِسے انتخابِ متن کا اصول بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ میں کسی ایک نسخہ کو بنیاد بنانے کے بجائے جتنے بھی نسخے دریافت اور دستیاب ہوئے ہیں سب کا مقابلہ اور مطالعہ کر کے اختلافی مقاموں پر بہترین صورت کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ بہترین سے مراد متن کی وہ صورت ہے جو تصنیف (نہ کہ ترمیم، اصلاح یا نظرِ ثانی) کے زمانے میں یا اُس زمانے میں جس وقت تک کے ترمیم و اصلاح کردہ متن کو مدوّن کیا جا رہا ہے، مصنّف اپنے مخصوص حالات اور علمیت کے مطابق وجود میں لایا یا لا سکتا تھا۔ اس مسئلہ کی طرف فراہمیِ متن کی ذیل میں بھی مجملاً کچھ عرض کیا جا چکا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دوسرے مخطوطات کے مقابلے میں خود مصنّف کی تحریر زیادہ وقیع ہوتی ہے لیکن اس کو کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ خود مصنّف سے بھی سہو ہو سکتا ہے۔ بہر نوع تصحیحِ متن کے لیے اپنے مآخذ کو بھی پرکھنا ضروری

ہے اور یہ بھی ایک فن ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تجربے میں یہ بات بھی آتی ہے کہ کبھی کبھی ثانوی بلکہ ضمنی مآخذ بھی اوّلین مآخذ کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہو جاتے ہیں اس لیے مدوّن کے لیے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ کسی بھی مآخذ سے سرسری گزر جائے۔ لازم ہے کہ اپنے وسائل کی حد تک کم و بیش سبھی مآخذ سے استفادہ کرے۔ اختلافِ نسخ کی صورت میں اخذ و ترک کا عمل مدوّن کے تنقیدی شعور اور اس کی فہم و فراست پر منحصر ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ مدوّن مصنّف کے فکر و شعور کو اس حد تک سمجھ لے کہ محض اُس بصیرت کے سہارے وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ مصنّف نے کون سی صورت کو واقعی وجود بخشا تھا۔ اس مقصد کے لیے وسیع مطالعہ اور نہایت غور و فکر شرط ہے۔ یہ درست ہے کہ کاملیت کا دعوٰی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کرنا چاہیے کہ بڑی حد تک حقیقت کو دریافت کر لینا ناممکن نہیں ہے۔

تصحیحِ متن کا مرحلہ اس وقت مشکل تر ہو جاتا ہے جب صرف ایک نسخہ دستیاب ہو سکے۔ اس صورت میں مدوّن کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ محض اپنے علم و عرفان پر اعتماد کر کے متن کا تعین کرے۔ اس مقصد کے لیے مصنّف کی دوسری تحریروں اور تصنیفوں کے علاوہ معاصرین کے علمی کارناموں کا بھی تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ کبھی کبھی غیر متعلق تحریروں کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔

کبھی کبھی کاتب بدخط یا غلط نویس بھی ہوتا ہے اور اس کی تحریر میں بعض لفظ یا تو سرے سے پڑھے ہی نہیں جاتے یا اگر ان کا پڑھنا ممکن ہو تو مفہوم اور محلِ استعمال سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی طرح وہ کبھی سہواً ایک یا زائد لفظ یا فقرے چھوڑ جاتا ہے اور یہ حذف عبارت کو مشکل بلکہ بعض اوقات ناقابلِ فہم بھی بنا دیتا ہے۔ مدوّن ایسے مقاموں پر چند علامتوں کا استعمال کرتا ہے۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

کوئی لفظ یا فقرہ اگر کتابت میں سہواً چھوٹ گیا ہو اور مدوّن اس کو یقین

کے درجے میں معلوم کرلے تو ایسے موقع پر قوسین کا بنا دینا مناسب ہے۔ اگر اُس لفظ یا فقرہ کو قیاس کیا جا سکے تو اسے قوسین کے اندر لکھا جائے گا ورنہ قوسین میں خالی جگہ پر نقطے بنا دیے جائیں گے۔

جہاں کوئی کلمہ واضح طور پر لکھا ہوا ہو لیکن اس کا مفہوم، محلِ استعمال، تلفظ یا املا سمجھ میں نہ آتا ہو یا مشتبہ ہو تو ایسے مقام پر اس کلمہ کے بعد قوسین میں سوالیہ نشان بنا دیا جائے۔ سوالیہ نشان کو قوسین میں بنانا اس لیے ضروری ہے کہ دوسری صورت میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ شاید وہ متن کا جزو ہے۔

مخطوطہ کی کہنگی، بوسیدگی یا کرم خوردگی کی وجہ سے کبھی کبھی بعض لفظ ضائع ہو جاتے ہیں۔ اِس کے اظہار کے لیے نقطے بنا دیے جاتے ہیں۔

متن میں کسی کلمہ کا املا، تلفظ یا مفہوم رواجِ عام کے خلاف ہو تو اُس کی نشاندہی کے لیے اُس کلمہ کے بعد قوسین میں لفظ "کذا" لکھ دینا چاہیے۔ قوسین میں لکھنے سے کلمہ "کذا" کو متن کی عبارت سے متمیز کرانا مقصود ہے۔

ترتیب و تصحیح کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ متن میں کوئی جز الحاقی تو نہیں ہے۔ الحاق کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ اوّل وہ کہ مصنف کے سوا کسی اور شخص نے متن میں کسی طور پر دخل دیا ہو۔ املا میں مصنف کے مسلک سے انحراف سے لے کر اپنی طرف سے بعض عبارتوں کو داخل کر دینے تک کے تمام معاملات اِس الحاق کی ذیل میں آتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تصنیف کو مکمل کر لینے کے بعد بعض امور مصنف کے ذہن میں آئے ہوں اور خود اُس نے اُن کو متن کا جزو بنا دیا ہو۔ پہلی صورت میں بھی الحاق کا پتہ لگا لینا مشکل ہے لیکن عموماً دوسری صورت کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔ الحاق کا پتہ لگانا تحقیقی عمل ہے اور اِس کے لیے کوئی کلیہ وضع کرنا ممکن نہیں ہے۔ مختلف مآخذ اور شہادتوں کی مدد سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ زبان و بیان، لہجہ، تلفظ، املا اور کبھی فکر و خیال کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی حقیقت تک رسائی میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

جب کوئی متن منتشر حالت میں دستیاب ہو، یا مختلف مآخذ سے اس کے اجزا

فراہم کیے گئے ہوں تو ہر مآخذ کی ثقاہت اور اہمیت پر الگ الگ غور کرنا چاہیے۔ بعض روایتیں ضعیف ہوتی ہیں لیکن ہر ضعیف روایت لازماً نامعتبر اور غلط نہیں ہوتی۔ بڑے سے بڑا دروغ گو بھی کبھی نہ کبھی سچ بول ہی جاتا ہے اس لیے کسی ضعیف روایت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے البتہ جب تک ان کی صحت یقینی طور سے ثابت نہ ہو جائے ضمنی یا مشتبہ مآخذ سے دستیاب ہونے والے متن کو تحقیق شدہ جُز کے ساتھ شامل نہیں کرنا چاہیے۔ اسے علاحدہ ضمیمہ کے تحت لکھنا چاہیے۔ روایت کے ضعف کے لیے جو دلائل ہوں اُن کی الگ تصریح کر دینی چاہیے۔ وہ حصص جو یقینی طور پر نامعتبر اور الحاقی ثابت ہو جائیں، دوسرے ضمیمہ میں جگہ پائیں گے۔ یہ اس لیے کہ آئندہ کام کرنے والوں کو اِن کو نامعتبر ثابت کرنے کے لیے کھکھیڑ نہ اٹھانی پڑے۔

کسی انتخاب کی تدوین مقصود ہو یا کسی خاص جُز تک کام کو محدود رکھنا منظور ہو تو بات دیگر ہے۔ ورنہ مدوّن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بقدرِ امکان مکمل متن اور اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ معاملات، امور اور مسائل کو پیش کرے۔ اس سلسلے میں کوئی پیشگی رائے قائم کر لینا اصولاً غلط ہے۔ تمام ضروری مواد کا فراہم کر دینا مدوّن پر لازم ہے۔ تحقیق کے بعد کوئی جُز معتبر ثابت ہو، یا نامعتبر اِس سے نہ مدوّن کی شخصیت کا تعلق ہے اور نہ اس کے کام کی قدر و قیمت متاثر ہوتی ہے۔ مدوّن کا حقیقی مقصود بس یہ ہے کہ حقیقت اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے۔ کسی متن سے مدوّن کو ذاتی وابستگی نہیں ہونی چاہیے لیکن عملاً یہ بات نہایت مشکل ہے۔ متن یا موضوع سے اپنی ذات کو وابستہ کر لینا بہت عام ہے۔ تدوین یا تحقیق کا مقصد بہر حال یہ نہیں ہے کہ خواہی نخواہی کسی متن کو کسی غلط یا صحیح روایت کے مطابق ثابت کر دیا جائے۔

جب کوئی متن اصول و ضوابط کے مطابق مدوّن و محقّق ہو جائے تو اس کے مطالعہ اور تجزیہ کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے لیے "تنقیدِ متن" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ اِس شعبہ کا معاملہ وہ ہے جو اِس شعر میں بیان ہوا ہے

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر ہنرور اپنے ہی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

تنقیدِ متن سے مقصود یہ ہے کہ مدوّن یہ دیکھے کہ جو متن اس نے نہایت محنت وکاوش سے فراہم کیا ہے اس میں کوئی امر یا نکتہ ایسا تو نہیں ہے جو علمی حقائق اور امورِ واقعی سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اِس شعبہ کے بھی چند مراحل ہو سکتے ہیں مثلاً:

(الف) متن کا بغور مطالعہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ اس کا کوئی جُز یا مقام کسی دوسرے جُز سے متناقص تو نہیں ہے یعنی ایک جگہ کچھ لکھا ہو اور دوسرے موقع پر کچھ اور ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کے اسباب و علل کا پتہ لگا کر ان کا جائزہ لینا ہوگا۔

(ب) متن میں جن واقعات یا امور کا ذکر آیا ہے کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو اس زمانے میں جب وہ متن وجود میں آیا رائج یا ممکن الوقوع نہیں تھا۔ اگر ایسی کوئی صورت سامنے آئے تو وہ بہت اہم نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

(ج) جن افراد، مقامات، کتب اور مصطلحات وغیرہ کا ذکر متن میں آیا ہے ان کی بابت معلومات فراہم کر کے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس متن میں ان سے متعلق جو امور زیرِ بحث آئے ہیں وہ سب واقعی ہیں۔ اسی طرح جو واقعات مذکور ہیں وہ سب حقیقی اور تاریخی شواہد کے مطابق بھی ہیں۔

(د) متن کے املا، تلفظ اور حروف کی ساخت پر بھی غور کیا جائے گا کہ ان سے بھی متن کی صحت و ثقاہت کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی بہت اچھی بحثیں حافظ محمود خاں شیرانی نے ''پرتھی راج راسا'' اور ''خالق باری'' میں کی ہیں۔

زیرِ تدوین متن سے بعض علمی اصول و ضوابط بھی سامنے آ سکتے ہیں۔ اُن کو بھی جانچنا اور پرکھنا مناسب ہے۔ اِس طرح جو حقائق سامنے آئیں گے ان کی روشنی میں متن پورے طور پر قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے اور اب اسے ایک قابلِ قدر تحقیقی مأخذ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس طور پر تنقید کے مرحلے سے گذرنے کے بعد متن سے بعض نئے امور و مسائل از خود سامنے آ جائیں گے اور وہ باتیں جن کو اضافہ، جدت یا اختراع سے تعبیر کیا جائے نمایاں ہوں گی۔ متن کی اِس طور پر تنقید الحاقی حصص کے تعین میں بھی معاون ہوگی۔

عملِ تدوین کے سلسلے کی آخری کڑی ''توضیح متن'' ہے جسے تحشیہ بھی کہتے ہیں۔

مصنف بعض امور کے بیان کو سہواً یا عمداً نظر انداز کر دیتا ہے یا بعض کا ذکر کرتا ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ۔ اس کے سبب کئی ہوتے ہیں۔ مثلاً (الف) کوئی بات اتنی مشہور و معروف ہو کہ اس کے بیان کو تضیع اوقات اور غیر ضروری خیال کیا گیا ہو لیکن امتدادِ زمانہ سے ایسی ہو گئی ہو کہ عوام تو کیا، خواص بھی اس سے نا آشنا ہو گئے ہوں۔ (ب) کوئی بات ایسی ہو جس کا علم مصنف کے وقت میں نہ رہا ہو اور زمانۂ مابعد میں اس کی تفصیلات بھی معلوم ہو گئی ہوں۔ (ج) بعض امور ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہو گئی ہوں۔ اس قسم کے تمام مواقع پر مدوِّن اپنے زمانے کے مزاج اور تقاضوں کے پیشِ نظر متن کو مفید تر بنانے کے لیے ان کی کیفیت حاشیہ پر قلمبند کرے گا۔ اگرچہ ان حواشی سے متن غیر متأثر رہتا ہے۔ یہ تفہیم میں معاون ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی اہمیت ہے۔ تحشیہ اضافی عمل ہونے کے باوجود نہایت مفید اور ضروری ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے بغیر خود متن کی قدر و قیمت اور اہمیت کا تعین آسان نہ ہو، اس لیے یہ کام بھی سرسری نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی عمیق نگاہ اور وسیع مطالعہ ضروری ہے۔

یہاں تک تدوین کا کام پورا ہو جاتا ہے لیکن حوصلہ ہو تو کام کو مزید وقیع اور مفید بنانے کے لیے بعض صورتیں اور بھی ہیں مثلاً:

(الف) مختلف اسماء سے متعلق تاریخی اور واقعاتی تفاصیل قلمبند کی جائیں، جیسے ذوق کا مصرع ہے ع آج ہم درسِ اشارات و شفا کہنے کو ہیں

حاشیہ میں اشارات و شفا سے متعلق تفصیلات بیان کی جائیں۔ اسی طرح فراموش شدہ حاشیہ و اصطلاحات کی توضیح و تشریح کی جائے وغیرہ۔ ایک نام ایک متن میں ایک سے زائد مقاموں پر آ سکتا ہے اس لیے ان سے متعلق تفصیلات کو ایک الگ جُز کی حیثیت سے متن کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر لکھا جا سکتا ہے۔

(ب) قاری کی سہولت کے لیے اشاریے بھی تیار کیے جانے چاہیے۔

کام کو مکمل کر لینے کے بعد یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں مدوِّن کو کس قسم کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، کس نوعیت کے مسائل اس کے سامنے آئے اور ان کے حل کی کیا صورتیں کی گئیں۔ نئے تجربات اور معاملات جن سے

دوچار ہونا پڑا، ان کی کیفیت بھی قلمبند کی جانی چاہیئے تاکہ رہ نوردانِ شوق کی رہنمائی ہو۔

تدوین کے کام میں جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا، ان کا تعارف کرانا بھی افادیت سے خالی نہیں ہے۔ اس تعارف میں اُن مآخذ کی اہمیت اور قدر و قیمت کے تعین کے علاوہ ان سے متعلق مدوّن کے تاثرات کا بیان بھی کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ تدوین متن سے اور اُس کی تدوین سے موجودہ معلومات میں کس حد تک اور کس نوعیت کے اضافے ہوئے، ان کا بیان بھی نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

متن کے مصنف کا بھی مجملاً تعارف ضروری ہے جس میں اس کے حالات، اس کی علمیت، اُس کے مزاج، مشاغل اور مختلف معاملات بھی خصوصاً وہ جن سے اس کی علمی اور تصنیفی کارکردگی کا تعلق ہو، قلمبند کیے جائیں۔ مصنّف کے عہد اور اس عہد کے علمی ماحول اور تقاضوں کا جائزہ بھی پیش کرنا چاہیے۔

یہ تمام باتیں تدوین کے عمل سے فرصت پانے کے بعد ہی لکھی جا سکتی ہیں لیکن قاری کے نقطۂ نظر سے اِن تفصیلات کو سب سے پہلے اس کے سامنے آنا بہتر ہے۔ اِس ضرورت کے سبب اِن تفصیلات کو "مقدمہ" کا نام دے کر متن سے پہلے جگہ دی جاتی ہے۔ اس طرح مقدمہ کسی کتاب کا وہ جُز ہے جو اپنے وجود کے لحاظ سے آخری لیکن مقام کے اعتبار سے اوّلین ہے۔

تفصیلاتِ بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدوّن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اہلِ تحقیق اور پھر اہلِ تنقید کے لیے صحیح ترین مواد، ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کر دے۔ مدوّن اس سائنسداں کی حیثیت رکھتا ہے جو تجربہ گاہ میں بیٹھا اپنے عمل میں مصروف رہتا ہے۔ داد و ستائش ہی سے نہیں، نتائج سے بھی بے نیاز، جو اپنی محنت کے ثمر کو اپنی محنت کا بہترین اجر سمجھتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ علم و دانش کی جو خدمت وہ کرتا ہے وہ اساسی اور بنیادی ہے۔ اس کی پیش کردہ معلومات پر ہی لغات، قواعد اور نظریات کی عمارتیں قائم ہوتی ہیں۔ ظاہر بیں عمارت کے سربفلک میناروں، اس کے در و دیوار کی جگمگاہٹوں کو دیکھتے ہیں۔ کم نظروں کی نگاہوں کو خیرہ کر دینے کے لیے یہی کافی ہیں۔ زمین کی گہرائیوں

میں پوشیدہ بنیادوں پر کوئی صاحبِ نظر ہی نگاہ کر سکتا ہے کہ ان کی استقامت کے سہارے پر ہی یہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ وہ اگر متزلزل ہو جائیں تو ساری عمارت زمین پر آ رہے۔ اس کی شان و شوکت سب خاک میں مل جائے۔ اہلِ تدوین کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے کارناموں کی داد عوام ہرگز نہیں دے سکتے۔ ان کی کاوش، محنت اور جگر کاوی کو کسی صورت سے بھی اُس طرح نمایاں ہونا میسر نہیں آسکتا جس طرح دوسروں کو ہے۔ یہ اہلِ تدوین کا مقدر ہے اور انھیں اسی مقدر پر صابر و شاکر بلکہ متفاخر رہنا چاہیے۔ کیا یہ بات ان کے لیے کم فخر کی ہے کہ اُن کی طبعِ سلیم جو ایک نکتہ پیش کر دے وہ کتنی ہی تحقیقوں اور تنقیدوں کے وجود میں آجانے کا سبب بن سکتا ہے۔

حواشی

(۱) مولانا محمود کی تحفۃ السعادت (تالیف ۹۱۶ھ) میں ہے: "تائے مضموم و فائے مفتوح۔ نے خامی یا چوبے خالی کردہ کہ بداں غلولہ اندازند" (پرتھی راج راسا ص ۳۱۹ تا ۳۲۱)

(۲) پنجاب میں اردو ص ۱۰۶ تا ۱۰۷

(۳) مقالاتِ شیرانی ج ۱ ص ۱۴۴

(۴) اخبارِ اردو، جولائی ۱۹۸۲ء

(۵) تدوین: جمع نمودن و تالیف کردن (غیاث ص ۹۴) تالیف: دو چیز یا چند چیز را باہم پیوستگی و ربط دادن و بمعنی جمع نمودن یا ترتیب (ایضاً ص ۹۰) ترتیب: راست کردن درجۂ ہر چیز و نہادنِ چند چیز را بمقام و مرتبۂ خود (ایضاً ص ۹۵)

(۶) دیوانِ ذوق، ص ۳۰۵

(۷) متن بفتحِ میم و سکون تائے فوقانی بمعنی پشت و بمعنی استوار و جائے بلند و سخت و مجازاً بمعنی عبارتِ کتابے کہ شرحِ آں تواں کرد۔ بمعانی مذکورہ بفتحتین خواندن خطاست (غیاث ص ۳۸۰)

(۸) آبِ حیات ص ۳۴۱

(۹) علی گڑھ تاریخ ص ۲۴

(۱۰) ۱۹۷۰ء میں پروفیسر آل احمد سرور نے دیوانِ غالب کا "نسخۂ عرشی زادہ" راقم کو عنایت کیا۔ راقم نے اس کے "بخطِ غالب" ہونے پر شبہ کا اظہار کیا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک نامور محقق نے سرور صاحب کو لکھا کہ آپ نے اِس کو اپنے شعبہ میں کیوں رکھ چھوڑا ہے (یعنی ملازمت سے برطرف کیوں نہیں کر دیتے)۔ پروفیسر گیان چند نے صفائی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ڈاکٹر انصار اللہ کے عالمانہ اعتراضات کے باوجود اِسے غیرِ غالب کی تحریر قرار دینے کو جی نہیں چاہتا لیکن انصار صاحب کے تمام اعتراضات کا جواب بھی ممکن نہیں۔" (ہماری زبان دسمبر ۱۹۷۰ء)

مآخذ

۱۔ آبِ حیات — مولانا محمد حسین آزاد — یو پی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۲۔ پرتھی راج راسا — حافظ محمود خاں شیرانی — انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۳ء

۳۔ پنجاب میں اردو — حافظ محمود خاں شیرانی — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۸ء

۴۔ دیوانِ ذوق — (مرتب) محمد حسین آزاد — دہلی ۱۹۳۳ء

۵۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) — مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۲ء

۶۔ غیاث اللغات — مطبع انوار محمدی، لکھنؤ

۷۔ مقالاتِ شیرانی (جلد اول) — مرتب مظہر محمود شیرانی — لاہور ۱۹۶۶ء

۸۔ اخبارِ اردو — کراچی — جولائی ۱۹۸۲ء

۹۔ ہماری زبان — علی گڑھ — یکم، ۸ دسمبر ۱۹۷۰ء

عتیق اللہ

شعرِ میر میں بیان اور بیان کنندہ کی نوعیت

افلاطون اور پھر ارسطو نے بیان کنندہ کی تین قسمیں بتائی ہیں :

الف : وہ جو اپنے مخاطبہ میں صرف اور صرف اپنی آواز کا استعمال کرتا ہے۔ اس نوعیت کے مخاطبہ میں مخاطب پردۂ غیاب میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیان کنندہ کا خطاب محض اپنے آپ سے ہو یا ایسی فرض کردہ ہستی سے ہو، جس کے وجود و عدم وجود پر وثوق سے کوئی حکم ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

ب : وہ مخاطبہ جس میں کسی دوسرے شخص یا بہت سے اشخاص کی آواز کو تصرف میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ آواز بیان کنندہ کی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ ایسی مثال میں اس کی ہستی دوسری ہستی کے لیے ایک میڈیا کا کردار ادا کرتی ہے۔ افسانوی ادب میں اس قسم کی آواز سے بالعموم سابقہ پڑتا ہے۔ مصنف اپنے ہی عاید کردہ جبر کے تحت اپنی شخصیت اور اپنے جذبوں کے تئیں ایک اجنبی ہستی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مصنف اور ہستیِ دگر کی روشنی میں اس صورتِ حال کو ایک متناقص صورتِ حال سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ج : وہ بیان کنندہ جس کی آواز نے، خود اپنی اور دوسرے یا دوسروں کی آواز کے تال میل سے ترکیب پائی ہو۔ یعنی بیان کنندہ اور دوسروں کی آواز سے مرکب ممزوجہ ہم اسے ممزوجہ آواز بھی کہہ سکتے ہیں۔

میر کو ہم بنیادی طور پر غزل ہی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ غزل کے شاعر سے یہ توقع ہی فضول ہے کہ وہ کسی ہستیِ دگر کی آواز میں بات کرے گا یا ممزوجہ آواز پر اس کی تاکید ہو گی۔ میر نے بھی صرف اور صرف اپنی ہی آواز میں گفتگو کو ترجیح دی ہے مگر اس کے معنی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تین آوازوں میں سے اس پہلی آواز کے بھی نہیں ہیں، جس کا مخاطب

خود شاعر کی ذات ہوتی ہے یا کوئی ذات ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ میرؔ کی آواز اُس دوسری آواز سے کسی نہ کسی حد تک ضرور مماثل ہے جس کا خطاب ایلیٹ کے لفظوں میں کسی سامع یا سامعین سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی۔ والی صرف ایک غزل کی مثال ہی کافی ہے جس میں بالآخر نویں شعر پر آ کر میرؔ ہستیِ دگر سے اس کی سرد مہری کا شکوہ براہِ راست اِن الفاظ میں کرنے لگتے ہیں:

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سُنی آہ کہانی اُس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دِیے لوگوں کو
شہرِ دِلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی

میں یہاں خطاب کے لفظ کے ساتھ دوسرے کی شمولیت اور شرکت جیسے لفظ کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میرؔ جب بھی خطاب کرتے ہیں یا کسی دوسری ہستی کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں تو اُن کا اشارہ ہستیِ دِگر میں ضم ہونے کے علی الرغم ہستیِ دِگر کی شرکت کی طرف ہوتا ہے:

دیکھو تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
شب ہا بحالِ سگ میں اِک عمر صرف کی ہے
مت پوچھو اُن نے مجھ سے جو آدمی گری کی

میرؔ کے اشعار میں شمولیت محض انسان کی شمولیت ہی پر حد قایم نہیں کرتی بلکہ فطرت کے مظاہر بھی اس میں شامل ہیں۔ میرؔ نے جا بجا کلی، غنچہ، گُل، صبا، بلبل اور طائر وغیرہ سے یا تو براہِ راست مکالمے کی طرح ڈالی ہے، یا انھیں اپنے جذبے کے مناسب کشود کے لیے معروضی تلازمے کے طور پر برتا ہے، یا اُن کی مدد سے کوئی دلیل قایم کی ہے یا اپنے ہی کسی دعوے یا خیال کو مستحکم کیا ہے:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اِس شعر میں شاعر کا مقصود غالباً یہی بتانا ہے کہ موجودات کی ہر شے ایک محدود و مقررہ مہلت کی حامل ہے اور اُن میں بھی پھول جیسی حسین ترشے کی زندگی کی مہلت یا مہلتِ انبساط لمحہ دو لمحہ سے زیادہ نہیں۔ بے ثباتیِ دنیا کا مضمون بالخصوص مشرقی شاعری کا ایک اہم حاوی مضمون ہے، جسے شعرا مختلف اسالیب میں باندھتے آئے ہیں۔ میر کا زیادہ پسندیدہ مضمون جبر و اختیار سے متعلق ہے۔ غور کیا جائے تو اِس شعر کی تہ میں بھی جبر و قدر کا یہی مفہوم کارفرما ہے۔ شاعر نے فطرت کے محض ان اجزا کو ذریعہ بنا کر بے ثباتیِ دہر کے دعوے کو مستحکم کیا ہے، جو خوبصورت ہیں۔ اس طرح کلی کے تبسم میں رقت اور الم ناکی کے طنز آمیز پہلو تو مضمر ہیں ہی عبرت کا بھی ایک پہلو مقتدر رہے۔ جس سے متن، اخلاقی قصد کا حوالہ بھی بن جاتا ہے۔ کسی جمالیاتی ترکیب میں اخلاقی عنصر کو بخوبی نبھا لینا اتنا آسان نہیں ہوتا، میر اور ان کے بعد غالب ہی کو یہ شعار آتا تھا:

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے خدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار۔ وغیرہ وغیرہ۔

محولہ بالا پوری کی پوری غزل میں بیان کی سطح قطعی آشکار ہے۔ اِسے بیانِ واقعہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے یہاں کھل کر شمولیت کا اقرار کیا ہے اور آواز وہی جو ایلیٹ کی دوسری اور افلاطون کی پہلی آواز سے مرکب ہے۔ "کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات" میں بیان بلکہ بیانِ واقعہ کی جہت اندر کی طرف ہے اور معنی پر ابہام کی ایک ہلکی سی دھند بھی محیط ہے۔ تاہم میر یہاں بھی کم سے کم لفظوں میں ایک پوری واردات کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔

میر کے بارے میں عام رائے یہ رہی ہے کہ وہ ایک جذباتی شاعر ہیں۔ ان کے سارے جذبوں میں عشق کا جذبہ سب سے ہمہ گیر ہے گویا عشق کا جذبہ ان کی پہلی واردات ہے اور ان کے دیگر جذبے اسی ایک جذبے سے ماخوذ ہیں یا اس سے نمو پاتے ہیں۔ اِس

خیال کے بھی اپنے جواز ہیں کہ عشق کا جذبہ جسے بعض شعرا نے محض اکتساب کے ذریعے اخذ کیا ہے اور تھوڑا بہت اپنے تخیل کا آب و رنگ دے کر اسے ایک نیا تجربہ بنانے کی سعی کی ہے۔ میر کے یہاں بھی اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ہم ان مثالوں کو بین المتونی اثر و تعامل کا نتیجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میر کا اپنا ایک انفراد بھی ہے کہ وہ اس جذبے یا دوسرے لفظوں میں اس قسم کے مضامین کو بڑے الھڑ، بڑے شوخ اور بڑے بے نیازانہ طریقے سے ادا کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ آواز تو میر کی اپنی ہوتی ہے لیکن اس کی تاکید، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اپنے جذبوں میں دوسرے کی شمولیت پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر نے اپنے بہترین اور منتخب اشعار میں اکثر متکلم کو صیغۂ غایب میں استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں اور اکثر ڈرامائی لمحوں میں متکلم اور غایب دونوں بڑی خوبی کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:

سن سن کے دردِ دل کو بولا کہ جاتے ہیں ہم
تو، اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر

میر جذبوں کے اظہار میں اتاولے نہیں ہو جاتے۔ یعنی اظہار میں وہ بے ساختگی جو فوری ردِ عمل کا نتیجہ ہوتی ہے اور جسے عام طور پر میر سے مختص کیا جاتا رہا ہے، میر کے یہاں کم سے کم ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانی جذبوں اور انسانی تجربوں کے شاعر اسی لیے ہیں کہ واردات اور اظہار کے مابین ایک خاص مہلتِ زماں کی فصل کا انھیں ہمیشہ لحاظ رہا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں واردات اور اظہار کے مابین ایک خاص مہلتِ زماں کا فاصلہ اظہار میں جذباتی دھند کو بھی رفع کرتا ہے۔ ورڈز ورتھ نے شاعری کو Emotions recollected in tranquil ity کہا تھا۔ اس خیال سے میں ایک یہ بھی تاثر لیتا ہوں کہ عالمِ سکون میں جذبوں کی باز آفرینی سے اُس لجلجے پن کا اندیشہ کم سے کم رہ جاتا ہے جس کا واقع ہونا فوری اظہار میں ہمیشہ اندراز امکان ہوتا ہے۔ میر کے جذبوں میں بالیدگی، بلوغت، گوناگونی اور اکثر کھلنڈرے پن کی سی کیفیت اسی معنی میں پائی جاتی ہے کہ انھیں نہ تو محض چند مخصوص جذبوں کا رسیا ہونا گوارہ ہے اور نہ جذبوں کا فوری اظہار ان کے لیے جمالیاتی طمانیت کا موجب ہوتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی غزل گو شاعر کے یہاں جذبوں کا اظہار واقعاتی بیان یا بیانِ واقعہ کی شکل اختیار

کرتا ہے تو وہ اُس کی نااہلی کی دلیل ہے۔ میرؔ فوری ردِّ ہائے عمل سے گریز ضرور برتتے ہیں لیکن اِس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے جذبوں اور تجربوں میں شدّت ہی ناپید ہے۔ واقعاتی بیان سے بھی میری مراد یہ نہیں ہے کہ واقعاتی بیان، سچّے جذبوں کو مسترد کرنے کا نام ہے۔ میرا مُدّعا تو صرف یہ ہے کہ میرؔ کو بیانِ واقعہ سے خاص دلچسپی ہے وہ اکثر اپنے نجی تجربوں، ذاتی وارداتوں اور حتیٰ کہ روایتی شاعرانہ مضامین کو کبھی گہری سنجیدگی اور کبھی بڑے چٹخارے کے ساتھ کچھ اس طور پر بیان کر جاتے ہیں کہ میرؔ کو کسی ایک خاص کیفیت، کسی ایک خاص اور حاوی تجربے اور حتیٰ کہ محض عشق کے جذبے کا شاعر قرار دینے کے معنی میرؔ کی غیر معمولی تخلیقی استعداد سے انکار کرنے کے ہیں:

آنے کو میری فرصت کتنی، دو دم، دو پل، ایک گھڑی
رنجش کیوں، کاہے کو خشونت، غصّہ کیا ہے، جاتا ہوں
ہائے سبک ہونا یہ میرا فرطِ شوق سے مجلس میں
وہ تو نہیں سنتا دل دے کر، میں ہی باتیں بناتا ہوں
گھر سے اُٹھ کر لڑکوں میں بیٹھا، بیت پڑھی، دو باتیں کیں
کِس کِس طور سے اپنے دل کو اُس بِن میں بہلاتا ہوں
قتل میں میرے یہ صحبت ہے غم غصّے سے محبت کے
لوہو اپنا پیتا ہوں، تلواریں اُس کی کھاتا ہوں
سر مارُوں ہوں لیدھر اودھر دُور تلک جاتا ہوں نکل
پاس نہیں پاتا جو اُس کو، کیا کیا میں گھبراتا ہوں

محفلِ محبوب میں تحقیر آمیز تجربے کی ایک صورت مذکورِ بالا پہلے شعر میں وہ ہے جسے میرؔ بڑی معصومیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرا تجربہ غالبؔ کے اس شعر میں ادا ہوا ہے:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کر ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

غالبؔ کے شعر میں ایک لطیف طنز پنہاں ہے۔ شاعر نے خود اپنے آپ کا مذاق اُڑا کر اپنی تحقیر و تذلیل کے لیے نفسیاتی اخراج کی ایک صورت نکالی ہے۔ ڈرامہ یہاں بھی ہے۔ غیر یعنی رقیب غیاب میں ہونے کے باوجود اپنے پورے وجود کے ساتھ تیسرا زاویہ

مکمل کر رہا ہے۔ غالب عاشق کی روایتی مجہولیت کے مقابلے پر معشوق کی ذہنی چابک دستی، تیزی اور طراری کا ثبوت فراہم کر کے قدرے تسکین حاصل کرتے ہیں جب کہ میر کے محولہ شعر میں عاشق Justification کی طرف مائل ہے وہ گلہ گزار بھی ہے اور دوسرے لفظوں میں فریاد کناں بھی کہ اے بھائی تمھاری محفل میں ہمیں کوئی ساری کی ساری زندگی تو گزارنی ہے نہیں۔ زندگی نے ہمیں فرصت ہی کتنی دی ہے پل دو پل۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ کیوں پیچ و تاب کھاتے ہو اتنا ہی برا لگا تو لو چلے جاتے ہیں۔ بیانِ واقعہ کی صورت دونوں اشعار میں موجود ہے۔ غالب کے شعر میں زمانے کے عدم تعین کا الگ لطف ہے اور میر کے صیغۂ حاضر کی واردات کا ایک علیحدہ مزہ۔ دونوں اشعار میں ڈرامائی عنصر کی کارفرمائی ہے۔ ڈرامہ اور بیان میں ضد ہے لیکن شعر کی ترکیب میں ڈرامائی واردات کو بیانیہ میں ادا کیا گیا ہے ایک نکتہ اور ہے؛ پہلے مصرعے میں دو دم، دو پل، ایک گھڑی میں جواز کے ساتھ اصرار و اعتماد بھی چھپا ہوا ہے کہ یوں نہیں تو ہستیِ دِگر کو یوں ماننا پڑے گا۔ پھر یہ کہ رنجش کے ساتھ کیوں۔ خشونت کے ساتھ کا ہے اور غصہ کے ساتھ کیا جیسے استفہامیہ کلمات سے عاشق اور معشوق کے تین کردار واضح ہوتے ہیں۔ عاشق پہلے بڑی سادگی سے پیش آتا ہے کہ بھائی کس بات کا لڑائی جھگڑا ہے۔ کیوں کا لفظ رنجش کے بعد آیا ہے جس سے آہنگ کا دھیما پن بھی ظاہر ہوتا ہے جبکہ خشونت سے پہلے استفہامیہ کا استعمال کیا گیا ہے کہ 'کا ہے کو خشونت' یہاں پہلے ٹکڑے کی نرمی، احتجاج میں بدل جاتی ہے۔ عاشق پہلے نرمی برتتا ہے، پھر تھوڑا سا سنبھلتا ہے اور معشوق کے نفرت انگیز اور تحقیر آمیز رویے کا جواز بھی مانگتا ہے اور معترض بھی ہوتا ہے کہ ہمیں آپ نے کیا ایسا ویسا سمجھ رکھا ہے۔ گویا ہم بھی کوئی آن کوئی مان رکھتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا ٹکڑا غصہ کیا ہے۔ کا ہے۔ یہاں میر نے غصہ کیوں ہے نہیں کہا ہے۔ کیونکہ کیا ہے میں آہنگ ایک دم بلند ہو جاتا ہے کہ غصہ کس لیے کرتے ہو۔ ہم تم کو یہ اجازت ہی نہیں دیتے کہ تم ہم پر غصہ کرو۔ یہی بات ہے تو تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ 'جاتا ہوں' کہہ کر ڈرامائی واقعے کو اپنے کلائمکس پر پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پہلا مصرع پھر پڑھیے:

آنے کی میری فرصت کتنی، دو دم، دو پل، ایک گھڑی

یہاں تکرار میں اصرار کا پہلو تو مخفی ہے ہی جب کہ جواز مقدر ہے۔ فرصت مہلت کے علاوہ فراغ کے دَورانیے کے معنی بھی فراہم کرتا ہے۔ یہاں میر نے 'کتنی' کا استفہامیہ استعمال کر کے یہ باور کرایا ہے کہ اس کے بعد ذرا رُکیں، ٹھہریں گویا کتنی اور دو دم کے درمیان ایک انتہائی خفیف Poetic pause ہے بلکہ اسے سکوتیہ Silence کہنا درست ہوگا کہ اب قاری شاعر کے جواب سے پہلے خود اس سکوتیے کو اپنے معنی سے پُر کرے۔ میر کہتے ہیں دو دم، دو پل، ایک گھڑی۔ دم بمعنی سانس، مراد زندگی بھی ہے، زور اور قوّت بھی اور ایک لمحہ بھی، پل بھی وقت کے ایک خاص میزان کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یعنی ایک سیکنڈ بلکہ پلیٹس نے ۲۴ سیکنڈ کی مہلت کے معنی بھی اخذ کیے ہیں۔ جب کہ گھڑی بالعموم ثانیے کے معنی میں مستعمل ہے۔ پلیٹس نے اس کے لیے ایک گھنٹہ مقرر کیا ہے اور ایک غیر مقررہ خفیف مہلتِ زماں بھی۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میر نے دم، پل اور گھڑی کو معنیِ مترادف کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ انھوں نے پہلے دم کہا ہے یعنی لمحہ دو لمحہ پھر پل کہا ہے یعنی ایک منٹ اس کے بعد (گویا بالترتیب) گھڑی کہا ہے یعنی ایک گھنٹہ۔ پہلے خفیف تر مہلتِ زماں کا حوالہ ہے، پھر اس سے طویل اور اس کے بعد اس سے طویل تر۔ گویا شاعر محفلِ محبوب میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ قیام کی مہلت بتاتا ہے کہ ہم اگر یہاں ٹھہرے بھی تو کتنا؟ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔ کیونکہ زندگی ہی نہیں وقت نے بھی اتنی فرصت کہاں مہیا کی ہے کہ اطمینان کے ساتھ پل دو پل، گھڑی دو گھڑی بھی گزار سکیں۔

بیان کنندہ کی حیثیت سے میر بار بار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ درجِ ذیل اشعار میں بھی بیانِ واقعہ کی سطح نمایاں ہے۔ میں یہاں بھی یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک صورت اس بیانِ واقعہ کی ہے جس کے حوالے سے شاعر اپنے سوانح کو موضوع بناتا ہے جیسے درجِ ذیل اشعار میں ہے:

یہ میرِ ستم کُشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحرِ بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دِلّی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھی، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا

یا وہ غزل جس کا پہلا شعر ہے:

یادِ ایّامے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور و شر سے میرے اِک فتنہ رہا کرتا تھا رات

دوسری صورت شعر کے construct کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ جسے قاری اپنے ذہن میں واقعے کی صورت میں مرتّب کرتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں جس آواز کے تعلق سے کہا تھا کہ وہ میرؔ کی آواز ہے، اس میں شمولیت کا قصد بھی پنہاں ہے۔ دوسری مثال کے طور پر درجِ ذیل چند اشعار پر اکتفا کر کے میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں:

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

چمن میں دل خراش آواز آتی ہے چلی شاید
پسِ دیوارِ گلشن نالہ کش ہے کوئی پر بستہ

ترے کوچے میں یکسر عاشقوں کے خار مژگاں ہیں
جو تو گھر سے کبھو نکلے تو رکھیو پاؤں آہستہ

سید محمد عبداللہ

خان آرزو کی نوادر الالفاظ

اُردو کی لغت نگاری کے سلسلہ میں میر عبدالواسع ہانسوی سے ممتاز تر اور اہم تر شخصیت سراج الدین علی خاں آرزو کی ہے۔ ان کا لغت نویسی کے علاوہ اُردو کی عام تعمیر و ترقی میں بھی بڑا حصہ ہے۔ مجموعۂ نغز کے مصنف کا قول اس کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔

"بمشابہ کہ علماء اہل حق را دامت برکاتہم امام ہمام قبلۂ انام ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ می گویند اگر شعرائے ہندی زبان را عیال خان آرزو گویند سزاست۔" (مجموعہ نغز، ج ۱، ص ۲۴)۔

یہ صحیح ہے کہ وہ اُردو کے اکابر شعرا میں شمار نہیں کیے جاتے اور ان کی تصانیف میں (جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا) ریختہ دیوان شامل نہیں۔ تذکروں میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ اشعار ان کی طرف منسوب ہیں باایں ہمہ اکثر قدیم و جدید تذکرہ نگار اُردو اور ریختہ کے سلسلے میں ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے ہیں اور اس دَور میں اُردو شاعری اور زبان کی ترقی کا سہرا انہی کے سر باندھتے ہیں۔ اس سے قدرتاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اُردو کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام دی ہے جس کے اقرار و اعتراف میں ان کے ہر معاصر کو رطب اللسان ہونا پڑا۔

میر تقی میر تذکرہ نکات الشعرا میں کہتے ہیں :

"ہمہ اوستادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوارند۔"

اسی طرح قائم نے مخزن نکات میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے "خان آرزو کو زبانِ اُردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ خان آرزو کی عظمت ان کی اُردو شاعری کی بنا پر نہیں کیونکہ اس کا سرمایہ بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ انھوں نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے شعرائے اُردو کو متاثر ضرور کیا ہے۔ ان کے مکان پر مشاعرے کی مجالس بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ مشاعرے کی دوسری محفلوں میں بھی ان کی شرکت کا حال تذکروں میں ملتا ہے۔ ان مجلسوں میں آرزو کی تنقید و اصلاح سے بہت سے شعرا نے فنِ شعر اور ذوق ادب کی تربیت پائی۔

ان کے شاگردوں کے کچھ نام تذکروں میں مل جاتے ہیں مگر اس فہرست کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے اور نہ اس سے آرزو کے اس وسیع اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے جو بارھویں صدی ہجری میں شاہ جہاں آباد کے علمی حلقوں پر ہوا کیونکہ اس زمانے کے تذکروں کے اوراق ان کی عظمت کے تذکروں سے مالامال ہیں۔ ان کی جو تصویر خزانۂ عامرہ، مردم دیدہ، سفینۂ خوش گو اور گُل رعنا میں نظر آتی ہے اس سے ان کے علم و فضل اور ان کے تبحر کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کے زمانے میں کوئی فارسی ماہر ہو یا ریختہ کا شاعر، ہر شخص ان کی ذات کو اپنے لیے مرجع سمجھتا تھا۔

غرض یہ ہے کہ خان آرزو کا علم و فضل اور فارسی شعر کے قواعد و دقائق پر عبور اور ان کی بے مثال شخصیت فارسی اور اُردو دونوں میں کام کرنے والوں کے لیے یکساں طور پر سرچشمۂ فیض اور شمعِ ہدایت تھی۔

کہنے کو یہ تو کہا جاتا ہے (اور کسی حد تک صحیح بھی ہے) کہ مظہر جان جاناں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ریختہ کو فارسی کے قالب میں ڈھالا مگر اس سے انکار نہ ہو سکے گا کہ اُردو کو فارسی کے انداز پر لانے میں آرزو کا بھی کچھ کم حصہ نہیں۔ لالہ سری رام' خمخانۂ جاوید میں صحیح لکھتے ہیں،

"انہی کی رسائیِ طبع کا نتیجہ تھا کہ اپنے فارسی مذاق کے پیریے میں اُردو کے اشعار میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا تھا۔" ان کی فارسی سے متعلق تصانیف کی فہرست طویل ہے، ان کا وطن اکبر آباد تھا۔ گوالیار میں بہ سلسلۂ ملازمت رہے۔ بعد میں شاہ جہاں آباد دہلی میں قیام ہوا۔ ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت (ہندی کتابی) ہندی، پنجابی اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان اوصاف کی بنا

پر ہندوستانی زبانوں کے متعلق ان کی زباندانی مسلم تھی۔

آرزو نے اُردو کے سلسلے میں ایک بڑی خدمت یہ انجام دی کہ انھوں نے خود اُردو میں شعر لکھ کر اور اپنے شاگردوں کو اردو شاعری کی طرف توجہ دلا کر اُردو کا وقار بڑھایا ان سے پہلے اُردو میں شعر کہنا علمی اور ادبی حلقوں میں باعث وقار نہ تھا انھوں نے اس داغ "بے اعتباری" کو ہمیشہ کے لیے دھوڈالا۔

آرزو کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی۔ ہندوستانی فیلالوجی کے ابتدائی قواعد وضع کیے اور زبانوں کی مماثلت کو دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔ یہ اصول ان کی کتاب مثمر میں بہ تفصیل ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ لغت کی کتابوں میں بھی جہاں موقعہ ملتا ہے وہ قواعد زبان کی بحث میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔

آرزو بطور لغت نگار

آرزو ایک بلند پایہ لغت نگار تھے۔ انھوں نے لغت نویسی کا معیار بلند کیا۔ فارسی کے عام لغت نگاروں کے مقابلے میں ان کی تحقیق وجستجو کا انداز نہایت عالمانہ اور محققانہ ہے۔ فارسی لغات میں فرہنگ جہاں گیری اس فن کی بہترین کتاب مانی جاتی ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ آرزو کی کتابیں (سراج اللغات وغیرہ) تحقیق کے اعتبار سے فرہنگ جہاں گیری سے بہت آگے معلوم ہوتی ہیں۔

جہاں تک اُردو لغت نگاری کا تعلق ہے ہم آرزو کو اُردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار قرار دے سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میر عبدالواسع ہانسوی کو ان پر تقدم ہے مگر فن اور معیار کے اعتبار سے خان آرزو ہی کو ترجیح حاصل ہے۔

اُردو لغت نویسی کے سلسلے میں آرزو کی تالیف نوادرالالفاظ بہت بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۶۵ء ہے چنانچہ آرزو نے نوادر میں لفظ بیساکھ کے ضمن میں خود تصریح کی ہے۔

"لیکن تفاوت در بیساکھ و فروری اتفاق می افتد چناں کہ امسال کہ نوروز بست و چہارم محرم ۱۱۶۵ھ واقع شدہ و آں غرۂ فروردی است و در بیساکھ نوزدہ یا بست روزمی باید"

نوادر کا سبب تصنیف آرزو نے دیباچے میں خود بیان کیا ہے۔

"می گوید فقیر حقیر... آرزو کہ یکے از فضلائے کامگار و علمائے نامدار ہندوستان جنت فشان کتابے در فن لغت تالیف نمودہ مسمی بہ 'غرائب اللغات' و لغات ہندی کہ فارسی یا عربی یا ترکی آں زباں زد اہلِ دیار کمتر بود در آں با معانی آں مرقوم فرمودہ چوں در بیان معانی الفاظ تساہلے یا سقم بہ نظر آمد لہٰذا نسخہ دریں باب بقلم آوردہ جائے کہ سہو و خطائے معلوم کرد اشارات بداں نمودہ و نیز آں چہ بہ تتبع ناقص ایں کمال دوست درآمد براں افزود"

کہنے کو تو یہ تالیف 'غرائب اللغات' کی تصحیح و ترمیم ہے مگر ان مفید اور عالمانہ تنقیدوں اور اضافوں کو دیکھ کر جن کا ثبوت ہر ہر صفحے پر ملتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تالیف اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور غرائب کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

آرزو نے معنوی اصلاح کے علاوہ غرائب کی ترتیب کو بھی درست کیا ہے کیونکہ غرائب میں پہلے حرف کی رعایت تو تھی دوسرے حروف کی رعایت ملحوظ نہ تھی۔ آرزو نے نوادر میں اس سقم کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

آرزو نے غرائب کے سب الفاظ کو نوادر میں لے لیا ہے (ہر چند کہ ان الفاظ کے تلفظ اور املا وغیرہ کے سلسلے میں اعتراضات بھی کیے ہیں) انھوں نے اپنی طرف سے جن الفاظ کو شامل کیا ہے وہ یا تو ہندی کتابی (سنسکرت) سے متعلق ہیں یا پھر فارسی اور ترکی کے ایسے الفاظ ہیں جو اردو کا جزو بن گئے ہیں (جن کو غرائب کے مصنف نے خاص فارسی سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کیا تھا۔ اسی طرح آرزو نے بعض جملوں کا اضافہ کیا ہے جس کی بنا پر نوادر میں مفردات کے علاوہ چند مرکبات اور جملے بھی زائد شامل ہو گئے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں)۔

غرائب اور نوادر کی تقابلی حیثیت پر میں غرائب کے ضمن میں مختصر بحث کر آیا ہوں جس کا ملخص یہ ہے کہ غرائب ایک معمولی کتاب ہے جس کا مطمح نظر سراپا تدریسی ہے اس کے مخاطب عام طالب علم ہیں۔ اس کے برعکس نوادر ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب ہے جس کے ناقدانہ حواشی فارسی اور اردو کی لغات میں اس کتاب کو بلند مقام اور رتبہ بخشتے ہیں۔

اس کے علاوہ غرائب کے الفاظ میں ہریانی تلفّظ اور قصباتی محاورہ وروزمرّہ کا عنصر غالب ہے اس کے مقابلے میں آرزو وقت کی فصیح ترین زبان کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

میر عبدالواسع نے جہلا اور عوام کی زبان اور الفاظ کو مستند اور صحیح قرار دے کر غرائب میں شامل کر لیا ہے مگر آرزو نے اگرچہ ایسے الفاظ کو نقل کیا مگر ان کے نزدیک عوام کے محاورے اور جہال کے الفاظ کو صحیح اور فصیح الفاظ کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ اس پر انھوں نے میر عبدالواسع پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔

اگرچہ خان آرزو بہت سے علوم میں کاملِ فن مانے جاتے ہیں مگر نوادر کے غائر مطالعے سے وہ ایک بہت بڑے زباں داں اور محقق کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی دوسری فارسی تصانیف مثلاً چراغِ ہدایت اور سراج اللغات سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ معانی اور مفہوم کے صحیح تعیّن کے علاوہ مترادفات کے باریک اور لطیف امتیازات سے بھی پورے پورے واقف تھے اسی تجربہ اور ژرف نگاہی کی بدولت ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نوادرالالفاظ میں ہر ہر صفحے پر معانی کی لطافتوں اور باریکیوں کو واضح کرتے ہیں اور لفظوں کی معنوی خوبیوں سے پردہ اُٹھا کر ہمیں ان کے اصلی تصوّرات کے قریب لے جاتے ہیں۔

ادا ایک عام لفظ ہے۔ مثلاً ادائے معشوقانہ، یا نازوادا وغیرہ۔ میر عبدالواسع اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادا کیفیتے باشد معشوقاں راکہ بہ تقریر نیاید و ذوق آں رایابد، آں"۔ اگرچہ میر صاحب کی یہ تشریح عام طور پر غلط نہیں مگر تشنہ اور ناقص ہونے کے علاوہ آں کے یہ معنی نہیں۔ آرزو کے نزدیک یہ لفظ عربی کا ہے۔ فارسی میں اکثر حرکتِ موزوں کے معنی میں آتا ہے مثلاً ابرو و چشم کی موزوں حرکت کو بھی ادا کہیں گے۔ ادا بعض اوقات مطلقاً بمعنی حرکت آتا ہے مثلاً دائے خارج۔ غرض ادا معشوقوں کی کیفیت نہیں بلکہ ان کے اعضا خصوصاً چشم و ابرو کی حرکتِ موزوں کا نام ہے۔ اب رہا لفظ آں سو وہ آرزو کے بیان کے مطابق ادا سے الگ کیفیت کا نام ہے۔ یہ محبوبوں کی ایک جمالی حالت اور کیفیت ہے جس کی تعبیر کسی اور لفظ سے ممکن نہیں حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

ایک اور شعر میں کہا ہے:

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

برہان قاطع میں آن کے ضمن میں لکھا ہے:

"آن۔ نمک وچاشنی وحالتے وکیفیتے را نیز می گویند کہ درحسن می باشد و بہ تقریر در نمی آید"

اس ایک لفظ کی تشریح سے آرزو کی تحلیلی اور تجزیاتی صلاحیت کا حال اچھی طرح واضح ہوسکتا ہے۔

آرزو کی اس دقّت نظر اور وسعت علم کا اندازہ سراج اللغات وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے مگر نوادر کے صفحات میں اس کے محکم ترثبوت ملتے ہیں جس کی بنا یہ ہے کہ ان لغات کے برعکس نوادر میں محض تشریح و توضیح ہی نہیں بلکہ غرائب کی تنقید بھی ہے۔

اس کی وجہ سے آرزو کو ہر موقع پر میر عبدالواسع کی مبہم اور سست تشریحوں کو واضح اور چست کرنا پڑتا ہے چنانچہ اس فرض کے تقاضے سے مجبور ہو کر مختلف الفاظ کے معیّن تصوّرات ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس جھول کو دور کرتے ہیں جو عبدالواسع کی تشریحوں کا خاصّہ ہے۔

یہ مسلّم ہے (جیساکہ ایک دوسرے موقعہ پر بیان ہوا ہے) کہ میر عبدالواسع کی بہت سی غلطیاں عموم خصوص سے متعلق ہیں۔ چنانچہ آرزو کی تنقید و تصحیح کا بہت بڑا میدان بھی یہی ہے۔

مثلاً چھتری کا لفظ دیکھیے۔ میر عبدلواسع فرماتے ہیں:

"چھتری۔ جفتے کہ تاک انگور و بیارہ خیار و کدو وغیرہ برآں انداز ند، برم" آرزو اس کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن چھتری عم است وآں چوب یانئے باشد کہ باہم بندند درمیاں آں خانہ ہائے مربع گزارند و جفتے کہ برائے تاک انگور می سازند شنیدہ ام کہ آں را چھتی گفتہ باشد و نیز برائے بیارہ خیار و کدو ساختن چھتری مرسوم نیست پس غیر برم باشد و نیز در سالہ چھتری

آنست کہ دو چوب بلند را بہ زمین فرو برند تا کبوتراں و جانوراں دیگر برآں نشیند وآں را اڈہ نیز خوانند و ایں نیز خطاست چرا کہ در ہندی آں را چھتری نگویند بلکہ چھتری آنست کہ چند چوب یا نے درعرض وطول باہم بندند و بیک چوب یا جہاز چوب استادہ نمایند خواہ کبوتران را برآں نشانند و خواہ بیارۂ عشق پیچاں وآں چہ ما ناست بداں، برآں اندازند دو چوب کذائی را ہرگز چھتری نہ خوانند بلکہ اگر برائے جانوراں شکاری مثل باز و باشہ سازند بجواز گویند والا اڈہ۔

غالباً اس ایک تشریح سے ہی آرزو کے ذہن کے تنقیدی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بطور ایک لغت نگار کے ان کو صحیح تعیّن اور کامل تشخص کا ملکہ کس حد تک حاصل تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معنی اور مفہوم کے تعیّن میں جھول اور ڈھیلا پن گوارا نہیں کر سکتے۔ مگر میر عبدالواسع ہیں کہ دو لکڑیوں کو زمین میں گاڑ کر ان کو چھتری کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد اسی کو اڈّہ کے مترادف قرار دے کر اس پر کبوتروں کو بٹھا دیتے ہیں۔ حالانکہ فارسی اور اُردو زبان کے ذخیرے میں ان میں سے ہر ایک حالت کے لیے الگ الگ الفاظ موجود ہیں۔

آرزو کو اس قسم کی ڈھیلی لغت نگاری سے کس قدر چڑ ہے اس کی مزید توثیق کے لیے نوادر میں بارہ دری، ڈنڈیا، تھترا، تھتی، تیل، ٹٹی، بھڑوا، ڈنڈی، بڑ، تنکا، پہیلی، پینچی، تونبڑی، ڈنڈا اور اس طرح کی بے شمار تشریحات کو دیکھیے ان سے یہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ خان آرزو سست اور مبہم شرح کو کسی صورت گوارا نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ اشیا اور اسما کے متعیّن تصوّرات اور ان کی باریکیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک خاص بات جو آرزو کو فارسی اور اُردو کے لغت نگاروں پر تفوق بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ علمی وسعت کے علاوہ ان کی معلومات کا بہت سا حصہ علمی مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ وہ الفاظ کے مفہوم کے تعیین کے لیے صرف فارسی عربی کی قدیم لغات پر بھروسہ کر لینے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ان کی دی ہوئی معلومات کو ذاتی تحقیق اور چھان بین سے ٹھوک بجا کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لغت اور ادب کے عام مآخذ کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کی مستند کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، ملکوں کے عام طبعی

اور مجلسی حالات اور عام رسوم و رواج کی تحقیق کرتے ہیں، زندگی کے دوسرے اوضاع و اطوار کے معاملے میں ذاتی تجربہ کے ذریعے بھی تحقیق کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان سب مآخذات سے استفادہ کرنے کے بعد لفظوں کے اصلی مفہوم متعین کرتے ہیں اور تقریباً ہم معنی الفاظ کے لطیف امتیازات کو واضح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کا تعلق اپنے ملک سے ہے ان کے سلسلے میں عملی تجربہ اور مشاہدہ و تحقیق سے کام لیتے ہیں اور جو چیزیں ایران و توران سے متعلق ہیں ان کی ماہیئت ہندوستان میں آئے ہوئے ایرانیوں اور تورانیوں سے دریافت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ فلاں چیز یا قاعدہ یا رسم ہندوستان میں ہے توران میں نہیں یا توران و ایران میں ہے اور ہندوستان میں نہیں۔ وہ اس طریق کار کو صرف بیرونی ممالک کے حالات و واقعات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور خطوں کے معاملے میں بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل مثالوں سے ہو سکتی ہے۔

آڑو کی تشریح سے معلوم ہوا کہ میر عبدالواسع کے نزدیک آڑو اور آلوچہ میں کوئی فرق نہیں اس غلطی کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ آلوچہ غیر ملکی چیز ہے اس لیے ہانسوی نے سنی سنائی معلومات پر بھروسہ کرتے ہوئے آلوچہ کو آڑو قرار دے دیا۔ مگر آرزو کی تحقیق اس پر قانع نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "آڑو شفتالو کی طرح کا ایک میوہ ہے جس کا درخت بھی شفتالو سے مشابہ ہوتا ہے گویا یہ شفتالو ہی کی ایک قسم ہے۔ اور یہ جو غرائب میں اس کو آلوچہ کہا ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ آلوچہ ہندوستان کی چیز نہیں، البتہ اب تھوڑی مدت سے شاہ جہاں آباد کے باغات میں لگا دیا گیا ہے۔ اور میں نے کئی مرتبہ اس میوے کو دیکھا ہے مگر یہاں کا آلوچہ ترش ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کابل، کشمیر اور دوسرے ٹھنڈے ملکوں کا آلوچہ بہت لطیف اور میٹھا ہوتا ہے۔"

میر عبدالواسع نے بکتر اور چار آہنہ کو مترادف قرار دیا ہے اس پر لکھتے ہیں "لیکن چار آہنہ آہن چار پارہ است دو بر پیش و دو بہ پشت بندند و در ہندوستان بہ زرہ وصل کردہ پوشند، چار آہنہ ولایت بزرہ موقوف نیست، لہٰذا در محاورہ چار آہنہ بستن است و زرہ بکتر پوشیدن۔"

میر عبدالواسع نے تسھرٹا اور آفتابہ کو ایک چیز قرار دیا ہے مگر آرزو یہ کہتے ہیں کہ تسھرٹا خالص ہندوستان کا برتن ہے ایک گھڑے جتنا اس کا پیٹ ہوتا ہے اس میں نہانے کے لیے پانی گرم کرتے ہیں۔ نہانے کا یہ طریقہ ایران میں نہیں کیونکہ وہاں لوگ حمام میں نہاتے ہیں۔

میر عبدالواسع نے پپیہا کو شخش کا مترادف قرار دیا ہے۔ اس پر آرزو کہتے ہیں کہ پپیہا ہندوستان کا پرندہ ہے ایران میں اس کو ڈھونڈھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

اسی طرح میر صاحب ایران و توران میں پاپڑ کا سراغ لگاتے پھرتے ہیں۔ اور ایک لفظ سترغل اس کا ہم معنی لاتے ہیں مگر پاپڑ یہاں کی چیز ہے باہر کیسے مل سکتی ہے۔

آرزو نے توتا کے ضمن میں جو تشریح کی ہے۔ بے حد دلچسپ ہے:

"توتا۔ در رسالہ جانورے مشہور کہ طوطی گویند، ببغا.... بداں کہ توتی در ہندوستان جانورے باشد شبیہ بگنجشک مادہ و آواز خوش دارد و در بعضے وقت او را بنات و ہند، و جانورے کہ او را طوطی گویند غیر آں است و آں مطلق شکر نمی خورد و عامہ شعرائے ہند و ایران طوطی را شکر خوار گویند و حال آں کہ طوطی کہ آں را بہ ہندی توتا خوانند با شکر کارے ندارد و جانورے کہ شکر می خورد توتی است چناں کہ گذشت و او غیر توتا است پس نسبت شکر خواری بہ طوطی غلط باشد، باوجود دانستن ایں مراتب ما نیز ہمیں قسم می بندیم، چہ کنیم اتباع سلف را دریں قسم امور واجب می دانیم..."

ان مثالوں سے آرزو کی فراوانی معلومات اور مشاہدات زندگی اور تجربات کی وسعت کا حال بخوبی واضح ہوتا ہے۔ لغت نویسی کے اس اسلوب کی وجہ سے ان کو اردو فارسی کے لغت نگاروں میں ممتاز ترین مقام دیا جا سکتا ہے خصوصاً نوادرالالفاظ کے مصنّف کی حیثیت سے ان کا رتبہ بہت بلند ہے کیونکہ نوادر کو (لغت کی کتاب ہونے کے علاوہ) معلوماتِ عامّہ کا مخزن بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے بعض عجیب و غریب غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں جو عام معلومات کے اعتبار سے مسلّمات کی فہرست میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ نوادر کے بعض بیانات سے اس زمانے کے عام ملکی اور مجلسی حالات پر نہایت معلومات افزا روشنی پڑتی ہے۔

اس موقع پر میں چند ایسے الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں جن کے ضمن میں دلچسپ

معلومات اور مشاہدے درج ہیں۔

آڑو، اگاڑی، اندرسا، بکتر، بھگتیا، پاپڑ، پپیہا، پٹو، پتر، پنیر، پنڈول، تھتھرا، تکیا، توق، چھپرکھٹ، چھتری، چھتا، ڈلی، دستکی، ڈوریہ، راگنی، سرمنڈلہ، راشتا، سرنگ، سورج مکھی، سٹواسپلی، سہراسیس پھول، فیل مرغ، کھاٹ، کپڑکوٹ، گچی، سبو، گولاہسی، مور، ملک، تاس دانی، تلک، ڈھولکی، جامن، چنبیلی، چمبک، چھوڑنا، ٹیسو، چودھری، چیرا، ڈنڈیا، ڈنڈ۔

فیلولوجی یا لسانیات کے سلسلے میں سراج الدین علی خاں آرزو کا نام اس خاص حیثیت سے یکتا ہے کہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے فارسی اور ہندی (یا سنسکرت) کی وحدت اور توافق کا راز دریافت کیا۔ تقابلی لسانیات کے سلسلے میں جرمن فضلا نے بہت کام کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کارنامے کا سہرا عموماً انھی مستشرقین کے سر باندھا جاتا ہے۔ مگر ہمارا گمان یہ ہے کہ ایرانی اور ہندوستانی زبانوں کی اصولی وحدت کا انکشاف سب سے پہلے خان آرزو نے کیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے اپنی اکثر کتابوں میں اس بات پر بڑے فخر کا اظہار کیا ہے اور سراج اللغات، چراغِ ہدایت، شرح سکندرنامہ مثمر نوادرالالفاظ، غرض جہاں کہیں بھی انھیں اظہار کا موقعہ ملا ہے انھوں نے اپنی یکتائی کا اعلان ضرور کیا ہے۔

مثمر، خان آرزو کے لسانیاتی نظریات اور قواعدِ زبان کے سلسلہ میں بڑی قیمتی کتاب ہے۔ ہر چند موجودہ زمانے کی تحقیق کی وسعت کے پیشِ نظر آرزو کے بعض خیالات جن کا مثمر میں اظہار ہوا ہے آج لائقِ اعتنا نہ سمجھے جائیں گے بااین ہمہ اس کتاب میں اُردو فارسی فیلولوجی کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو آج بھی کارآمد ہیں۔ (اس اصول سے کہ فارسی اور ہندی میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں اور ان دونوں زبانوں میں اصولی وحدت موجود ہے) لغت نگاری کے سلسلے میں خان آرزو نے بہت فائدہ اٹھایا ہے چنانچہ مثمر میں ایک موقع پر لکھا ہے:

"تاالیوم ہیچ کس بہ دریافت توافق زبان ہندی و فارسی باآں ہمہ کثرت اہلِ لغت چہ فارسی وچہ ہندی ودیگر محققان ایں فن مہتدنہ شدہ اندالاّ فقیر آرزو؛ کسے

کہ متبع و پیرو ایں عاجز باشد وایں را اصل مقرر کردہ و بنائے تصحیح بعضے از الفاظ فارسیہ بریں گذاشتہ چناں چہ در کتب مصنفہ خود مثل سراج اللغہ و چراغ ہدایت وغیرہ نوشتہ ام و عجب است از رشیدی وغیرہ کہ در ہندوستان بودہ اند و ہیچ لحاظ نہ کردہ اند کہ دریں دو زبان توافق است (مثمر ورق ۹۲ ب، قلمی، پنجاب یونیورسٹی)

آرزو نے نوادر الالفاظ میں بھی توافق کے اصول سے بڑا کام لیا ہے۔ اور جا بجا اس اصول کے ماتحت قاعدے بناتے چلے گئے ہیں۔ ذیل کی فہرست میں وہ الفاظ درج ہیں جن میں آرزو کے نزدیک توافق پایا جاتا ہے یعنی یہ وہ الفاظ ہیں جو ہندی سنسکرت اور فارسی میں مشترک ہیں:

ابھر (فارسی ابر)، اپ (فارسی اب)، اجوائن (اجمود)، اڈا (فارسی ادہ)، آرا (فارسی ارہ)، اسو (فارسی اسپ)، بہات (عربی ہبط) بٹا (فارسی بتہ)، برجھی (فارسی برچخ)، بسورنا (عربی بسور، روترش کردن) بوتا، بوٹہ (فارسی بوتہ)، پہانہ (فارسی پانہ)، پٹو (فارسی پتو)، پرمیو (فارسی پرمیہ)، پھونک (فارسی پوک)، پونی (فارسی پنجک)، تھل (فارسی تل)، تن سکھ (فارسی تنسخ، تنسوق)، گلا (فارسی گلو بضمن ٹوپ) جوا (فارسی جمع، جوہ)، چھچ (فارسی ججج)، چھاگل (فارسی چنغل)، چاکسو (فارسی چشمک)، چپو (فارسی چپہ)، لاٹو (فارسی لاتو)، بضمن چکئی، چوکرہ (فارسی یا ترکی چہرہ)، چوچی (فارسی پچچو)، داک (فارسی تاک)، دیوک (فارسی دیوک) رندا (فارسی رندا)، رونگٹے رواں (روم، رونگ)، ریٹھا (فارسی ریتہ)، کھیس (عربی خیش)، گھڑی (فارسی گری)، بضمن گھڑیال۔ کچھوا (عربی کشف)، کرن (عربی قرن)، کونپل (فارسی کوپل)، کیس (فارسی گیس وگیسو)، گراہ (فارسی گراس)، لیل (فارسی لار، لیر)، ہینگ (فارسی انگ)۔

ہندی اور فارسی کے مشترک الفاظ کی یہ فہرست جامع نہیں۔ نوادر میں بہت سے اور الفاظ بھی اس طرح کے مل جائیں گے مگر یہ سوال باقی رہے گا کہ ان میں سے کون سے الفاظ ایسے ہیں جو اصولی اور بنیادی طور پر اس قدیم آریائی زبان سے متعلق ہیں جو دو حصوں اور دو شاخوں میں بٹ جانے سے پہلے کی زبان تھی۔ کیونکہ اس فہرست میں کچھ ایسے الفاظ بھی مل جائیں گے جو سنسکرت اور ہندی کے ذخیرے میں بعد کی فارسی سے داخل ہوئے اسی طرح وہ الفاظ بھی ہیں جو بعد کی ہندوستانی زبانوں سے

فارسی کے خلط ملط کا نتیجہ ہیں۔ آرزو نے اپنی ساری تحقیق کے باوجود اس امتیاز کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا بلکہ اپنی دریافت کے جوشِ مسرت سے مغلوب ہو کر عربی الفاظ میں بھی توافق کا اصول جاری کر دیا۔ حالانکہ اس زبان کے ساتھ ہندی یا سنسکرت کا کوئی رشتہ و پیوند قائم نہیں کیا جا سکتا۔

جیلی، کھلیان میں بالیوں کو سمیٹنے کے لیے ایک دو شاخہ لکڑی' آرزو لکھتے ہیں "در ہندی متعارف گوالیار کہ افصح السنہ ہندی است پچانگرا گویند"

اگل... "بہ زبان گوالیار کہ افصح زبان ہائے ہندی است بنیڈہ گویند"

گانڈر... "زبان مردم گوالیار و اکبر آباد کہ افصح السنۂ ہندی است..."

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل الفاظ کے ضمن میں بھی گوالیاری اور برج کا ذکر آیا ہے:

کنڈل، کھو، کپڑکوٹ، تلسی، باسی، ایت۔

گوالیاری زبان کے بارے میں آرزو کی اس رائے کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ وہ خود اکبر آباد اور گوالیار سے متعلق ہیں دوسرے یہ کہ اس زمانے تک خاص دہلی کی زبان کو وہ سرکاری اور مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اس کو حاصل ہوئی۔ دہلی کے عوام ایک مخلوط قسم کی زبان بولتے تھے جس کو بانگڑو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں ہریانی الفاظ اور قصباتی محاورے کی خاصی آمیزش تھی۔ خان آرزو نے اصلاح زبان کے سلسلے میں سب سے پہلے انہی الفاظ کی فصاحت اور عدم فصاحت کی طرف توجہ کی۔ اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اُردو کے ابتدائی لہجہ و تلفظ کو معین کرنے اور ٹکسالی اُردو کو مشتہر کرنے میں انھوں نے ایک موسس اور واضع اول کا کام کیا۔ اصلاح زبان کی باقی سب کوششیں اس کے بعد کی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خان آرزو کے زمانے میں زبان اُردو کی اصطلاح ایک مخصوص مفہوم اور محدود معنی رکھتی تھی۔ غالباً آرزو ہی پہلے مصنف ہیں جن کی تصانیف میں اردو کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ تحسین (نوطرز مرصع) شاہ مراد لاہوری (نامہ مراد) اور مصحفی کا زمانہ آرزو سے مؤخر ہے۔

نوادر الالفاظ میں لفظ اُردو کئی موقعوں پر آیا ہے مثلاً:

رجواڑہ.... بدیں معنی اصطلاح شاہجہاں آباد است بلکہ اہل اُردو است کہ ایں

قسم اماکن اکثر درلشکر راجہ ہامی باشند والا دراصل رجواڑہ جائے بودن است"
گزک ...." در اصطلاح اہل اُردو نوع است از شیرینی کہ از کنجد و شکر سازند"
نکتوڑہ ...." درعرف اُردو وغیرہ بمعنی صرف ناز و غرور است و بمعنی سوراخ بینی ..."
ہڑ پھنا...." بزبان اُردوئے اہل شہر نیست شاید زبان قریات و مواضع باشد دبدیں معنی بگلنا شہرت دارد"

اُردو کا لفظ خان آرزو کی تصنیف مثمر میں بھی بعض موقعوں پر استعمال ہوا ہے میں اس سے پہلے کہہ آیا ہوں کہ خان آرزو علاوہ فارسی کے ہندوستان کی بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ مگر جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان کا کمزور ترین پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں عربی زبان اور ادب میں وہ دسترس نہ تھی جو فارسی یا ہندوستانی کے معاملے میں انھیں امتیاز بخشتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر عبدالواسع ہانسوی کی کتاب کی تصحیح کرتے وقت وہ سب سے زیادہ عربی الفاظ کے معاملے میں پھسلے ہیں۔ بایں ہمہ عربی میں متوسط قابلیت انھیں حاصل تھی۔ انھیں قدرت نے فطری طور پر ایک زباں داں پیدا کیا تھا اس لیے عربی میں بھی وہ اور فارسی لغت نگاروں سے بہتر ثابت ہوئے ہیں۔

ان کی زبان دانی اور عام لسانیاتی دلچسپی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ نوادر میں جابجا ہندوستان کی مختلف زبانوں کے حوالے سے الفاظ کی تصحیح و تعین کرتے ہیں۔ وہ رائج الوقت فصیح ہندی کے علاوہ مقامی بولیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس عام واقفیت کی وجہ سے انھیں الفاظ کی لغوی تحقیق اور ان کے مختلف تلفظات کے جانچنے کا خوب موقعہ ملا ہے نوادرالالفاظ کے اوراق میں انھوں نے جن جن ہندوستانی زبانوں کا تذکرہ کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

ہندی کتابی (سنسکرت)، گوالیاری (برج)، ہندی راجپوتی (راجستھانی)، کشمیری یا ہندی کشمیری۔ ہندی پنجاب (یعنی پنجابی)، زبان مردم پنجاب زبان اردو۔ زبان اکبرآباد و شاہجہاں آباد اصطلاح شاہجہاں آباد اہل اُردو۔ ہندی فصحا۔

زبان اُردو کے محقق اور مورخ کے لیے یہ بات فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نوادرالالفاظ عہد عالم گیری سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کی زبان اُردو پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے یہ وہ زمانہ ہے جس میں اُردو اپنی تعمیر کے عبوری دَور سے گزر رہی تھی اس زمانے میں اس کی جو حالت تھی اس کو جاننے

کے لیے غرائب اور نوادر دونوں ہمارے لیے نہایت مفید مآخذ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ غرائب اور نوادر کی زبان اور الفاظ کا فرق نہ صرف قصباتی اور شہری محاورے کا فرق ہے بلکہ اس سے اورنگ زیب اور محمد شاہ اور احمد شاہ کے ادوار کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہرچند کہ یہ دَور بہت مختصر ہے مگر زبانِ اُردو کی تعمیر کے سلسلے میں اس کو بحرانی اور انقلابی دَور کہا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے نوادر الالفاظ زبان کے مطالعہ کے سلسلے میں بڑی قیمتی کتاب ہے کیونکہ اس کے ذریعے اس زمانے کی معیاری زبان کا حال معلوم ہوتا ہے۔ خان آرزو نوادر الالفاظ میں کئی موقعوں پر غرائب کے الفاظ کو "زبان جہال" یا "زبان وطن صاحب رسالہ" کے پُرحقارت نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں گوالیاری زبان کو ہندوستان کی فصیح ترین زبان قرار دیتے ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل الفاظ کی تشریح کے ضمن میں لکھا ہے:

"ایواڑہ۔ بمعنی باڑہ"۔ آرزو کہتے ہیں "ایواڑہ زبان وطن صاحب رسالہ خواہد بود.... بہ زبان برج وگوالیار کہ افصح است آں را کھرک گویند"۔ ایک جگہ پہلوی اور دری کا فرق انھوں نے یہ بتایا ہے:

"از تعریف ایں ہر دو زبان چناں واضح میشود کہ دری قرار دادہ مردم کوہ وورہ است و پہلوی زبان شہر و پہلو نزد مجدالدین توسی از عالم اُردو است۔ حالا بہ تحقیق پیوست کہ دری و پہلوی در معنی یکے است چراکہ دری عبارت ازاں است کہ بر در ملوک و سلاطین بداں تکلم می نمودند و پہلوی آں کہ در پہلو کہ عبارت از اُردو است براں تلفظ داشتند... پس بہ تحقیق پیوست کہ افصح زبان با زبان اُردو است و فارسی ہمیں جا معتبر است و زبان خاصۂ ہر ملک در شعر و انشا منظور نیست، ازیں جا است کہ شاعر از ہر ملک مثلاً خاقانی از شروان و نظامی از گنجہ و سنائی از غزنین و خسرو از دہلی بہمان "زبان مقرر" حرف زدند و آں نیست مگر زبان اُردو (مثمر قلمی، ورق ۶، ۷)

یہ سارا بیان فارسی سے متعلق ہے اور اس میں جہاں کہیں اُردو کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہماری زبان اُردو سے براہ راست علاقہ تو نہیں رکھتا مگر اس سے زبان اُردو کے بنیادی معنی و مفہوم اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ گویا آرزو کے نزدیک زبان اُردو وہ ہے:

(۱) جس میں بادشاہ اور امرا و سلاطین تکلّم کرتے ہیں۔
(۲) شہری زبان (بمقابلہ قصبات کی زبان کے)۔
(۳) وہ "زبان مقرر" (یا ٹکسالی اور معیاری زبان) جو ادب و شعر انشا کی زبان بننے کے قابل ہوتی ہے اور لوگ اسی کو معیاری زبان سمجھتے ہیں۔ زبان اُردو کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے میں مثمر سے ایک اور اقتباس پیش کرتا ہوں :

" ولفظ برسات کہ بفتح ہائے موحدہ وارئے مُہملہ و سین بالف کشیدہ و فوقانی بمعنی موسم مخصوص بارش ظاہرا ہندی الاصل است و می تواند محاورہ مولدین کہ عبارت است از اہلِ اُردو کہ اختلاط تمام بازبانہائے عربی و فارسی دارند" (مثمر قلمی ورق ۸۸، ۸۹)

خان آرزو عام ہندوستانی زبان یا زبانوں کے لیے ہندی کا لفظ لاتے ہیں (اور سنسکرت کے لیے ہندی کتابی) مگر اُردو ان کے نزدیک محاورہ مؤلدین ہے یعنی ہندی کی وہ خاص شکل ہے جو عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے تیار ہوئی ہے اس لفظ برسات کی تحقیق کرتے ہوئے مثمر میں لکھتے ہیں :

" و اہل اُردو موافق قاعدہ عربی آرند مثل پرگنات کہ جمع پرگنہ" (ورق ۸۸ ب)۔

"دادِ سخن" آرزو کی ایک اور تصنیف ہے اس میں اُردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" نیز بداں کہ نظیر ایں ماجرا احوال شعرائے ریختہ ہند است و آں شعرے است بہ زبان ہندی اہل اُردوئے ہند غالباً بطریق شعرِ فارسی و آں الحال بسیار رائج ہندوستان است و سابق در دکن رواج داشت بہ زبان ہماں ملک "

ان اقتباسات سے ہندی، زبان ہندی، اہل اُردو اور ریختہ کے حدود بہت حد تک معیّن ہو جاتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے آرزو کے کچھ اور اقوال ملاحظہ ہوں۔ چھنل۔ چھنال کے ضمن میں لکھتے ہیں :

" معلوم نیست کہ لغت کجاست مردم کہ از اہل ہندیم و در اُردوئے معلّٰی می باشیم نشنیدہ ایم"۔ رجواڑہ کی تشریح میں پہلے لکھ آیا ہوں :

" بدیں معنی اصطلاح شاہجہاں آباد است بلکہ اہلِ اُردو است کہ ایں قسم اماکن اکثر در لشکر راجہ ہا می باشند "

جیسا کہ پروفیسر شیرانی نے اپنے ایک مقالے میں تصریح کی ہے "آرزو کے نزدیک اردوے معلیٰ سے مراد شہر دہلی کی آبادی کا وہ حصہ ہے جو قلعہ معلیٰ کے قرب وجوار میں ملازمت شاہی کی وجہ سے آباد ہے اور جس میں فوجی منصب دار، درباری اور دیگر ملازمین شامل ہیں۔ یہ لوگ شہر کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں قدرتاً زیادہ شستہ اور مہذب سمجھے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس طبقے کی زبان زیادہ صاف ستھری ہوگی"۔ یہی وہ زبان ہے جسے آرزو مثمر میں " زبانِ مقرر" کا خطاب دے رہے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خان آرزو اُردو اور اُردوے معلّیٰ کی اس توضیح کے باوجود برج اور گوالیری زبان ہی کو "افصح السنۂ ہندی" کہتے ہیں اور الفاظ کی فصاحت کے سلسلے میں زبانِ دہلی کے مقابلے میں اس کو اہمیت اور ترجیح دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زبانِ اُردو کی حیرت انگیز ترقی کو دیکھیے کہ تھوڑے عرصے کے بعد سید انشاء اللہ خاں اسی کے متعلق دریائے لطافت میں لکھتے ہیں :

" ایں مجمع (یعنی اہل دہلی) ہر جا کہ برسد اولاد آں ہا دلی وال گفتہ شوند و محلہ ایشاں محلہ اہل دہلی، واگر تمام شہر را فرا گیرند آں شہر را اُردو نامند"۔

مگر اُردو اور زبانِ اُردو کا یہ وسیع مفہوم کچھ بعد کی چیز ہے جب شہر دہلی کی زبان کی مرکزی اور ادبی حیثیت علی العموم تسلیم کی جا چکی تھی۔

خان آرزو کے زمانے کی فصیح زبان اور بعد کی ٹکسالی زبان کا فرق اگر دیکھنا منظور ہو تو نوادر الالفاظ کے ان الفاظ کی فہرست بنا لیجیے جو فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات میں نہیں ملتے۔ آرزو کے زمانے میں اور ان کے بعد زبان کی اصلاح اور حذف و ترک کا جو سلسلہ شروع ہوا اور کم و بیش آج تک جاری ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوادر کے بیسیوں الفاظ جنھیں آرزو نے فصیح قرار دیا تھا زبان کے ذخیرے سے نکل گئے ہیں۔ آج ملک میں زبان کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کے سلسلے میں نوادر کے اس ذخیرۂ الفاظ سے پھر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی نوادر بہت اہمیت رکھتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آرزو نے میر عبدالواسع کی قصباتی اور عوامی زبان کے مقابلے میں شہری اور فصیح تر محاورے کو رائج کرنے کی کوشش کی اور جہلا کے تلفّظ اور لہجے کے مقابلے میں شستہ اور مہذب شہریوں کے تلفظ کو رواج دیا (مثلاً روش بر وزن ہوش

کی جگہ روش، بیرکھ کی جگہ بیرق اور زچّا کی جگہ زچا وغیرہ وغیرہ) مگر نوادر میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں جو آج دہلی تو کیا عام اُردو زبان میں بھی بہت کم استعمال ہوتے ہیں بلکہ بعض تو مطلقاً متروک ہو چکے ہیں مثلاً:

اہوری۔ ایبیا، باٹ موئی، بھنڈ پخت۔ بولوا۔ گرچھ۔ بھتی۔ دھمالا۔

اس کے علاوہ بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے تلفظ پر راجستھانی، پنجابی، ہریانی اور عام قصباتی رنگ غالب ہے۔ مثلاً بعض لفظوں میں ڑ کے بجائے ڈ: ماڈھی بجائے ماڑی، ساڈھو بجائے ساڑھو۔ اسی طرح پڑی بجائے پڑیا۔ پساری بجائے پنساری منجہ بجائے پلنگ، خلقا بجائے خرقا، گھلنا بجائے کشتی کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے الفاظ غرائب سے منتقل ہوئے ہیں مگر آرزو نے ان میں سے بیشتر کو اپنی کتاب کے بنیادی لفظ قرار دے کر اُن کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔

غرائب اور نوادر کے مطالعہ سے اُردو زبان کی تاریخ کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس پہلو کا تعلق دخیل الفاظ سے ہے۔ یعنی عربی فارسی اور ترکی کے ان الفاظ سے جو ہانسوی اور آرزو کے زمانے تک جزوِ زبان بن چکے ہیں۔

غرائب میں اس قسم کے الفاظ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو عوام کی زبانوں پر چڑھ کر کسی حد تک اپنی شکل اور صورت کو بھی بدل چکے ہیں۔ میر عبدالواسع عموماً اس قسم کے الفاظ کو ان کی آخری یعنی بگڑی ہوئی صورت میں لکھ کر ان کو خاص اُردو بنا لیتے ہیں اور ان کے لیے فارسی، عربی مترادفات لاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ الفاظ اس زمانے کی اُردو کا حصہ بھی بن چکے تھے مثلاً:

ادا، آن، اسپغول، آفتاوا، امام، اوریب بخاری، بقچا، بیرکھ، پتاوا، گربچہ، جلیبی، چپاتی، چاکو، چاکسو چھچا، چلون، خود، دلیا، روش، پوئیش، سورتی، ترکش، تانبا، (طعمہ) موچنہ، لوار، نہالی، سوغات، جلاہہ، ساری (لباس کا نام)، کھیس، سیکھ، شاہ بالا، سوغات وغیرہ۔

ان میں بیشتر الفاظ ایسے ہیں جن کی "اُردویت" اس حد تک مسلّم ہو چکی ہے کہ بہت کم لوگ ان کے حسب و نسب کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا ہوں گے۔

خان آرزو نے بھی نوادر میں اسی قسم کے چند الفاظ کا اضافہ کیا ہے (یعنی وہ ایسے

لفظ ہیں جو غرائب میں موجود نہیں) ان لفظوں کی وہ خصوصیت جو انھیں غرائب کے اسی قبیل کے الفاظ سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ میر عبدالستار کے لائے ہوئے الفاظ دخیل الفاظ کی آخری بگڑی ہوئی صورت میں (جس طرح کہ عام لوگوں میں مستعمل ہیں) ہمارے سامنے آتے ہیں مگر خان آرزو کے الفاظ اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں مثلاً خراش، فیل مرغ، قرقرہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ خان آرزو ان الفاظ کے جو خود فارسی وغیرہ سے آئے ہیں فارسی، عربی، ترکی مترادفات لانے کے حق میں نہیں۔

دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں آرزو کی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو اہلِ زبان (عوام وخواص دونوں) میں رواج پذیر ہو چکی ہو۔ ایسے لفظوں کے لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت سامنے رہنی چاہیے جو محض عوام ہی میں مروّج نہ ہو بلکہ عام وخاص سب کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہو۔

نوادر الالفاظ میں چند الفاظ ایسے بھی ہیں جو خالص سنسکرت (یعنی ہندی کتابی) سے براہ راست انھوں نے لیے ہیں۔ یہ لفظ غرائب میں موجود نہیں۔ معلوم نہیں ایسے الفاظ کو شامل کرنے سے آرزو کا مقصد کیا تھا۔ کیونکہ یہ لفظ بہت حد تک غیر مانوس ہیں اور اُردو زبان میں کبھی کھپ نہیں سکے۔ شاید سنسکرت سے واقفیت کا اظہار مقصود تھا۔ بہر حال ان کا یہ اضافہ چنداں قرینِ صواب معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً ذیل کے الفاظ:

اپاس، اپاسنا، اپ (-اب)، ابھر (-ابر)، ابسی، اکرن، اکترم، اسو (-اسپ)

آرزو کو سنسکرت زبان میں کہاں تک دسترس تھی اس کا صحیح اندازہ میں نہیں کر سکا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ ان کی واقفیت سرسری اور معمولی تھی۔

نوادر الالفاظ میں ضمنی طور پر قواعد زبان کے متعلق بھی مفید اشارے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہنا بے محل معلوم نہیں ہوتا کہ اُردو زبان کے صرفی اور نحوی قاعدوں کے سلسلے میں ہمارے پاس قدیم ترین کتابیں (مستشرقین کی بعض تصانیف سے قطع نظر) انشا اور قتیل کی دریائے لطافت اور اس کے قریب زمانے کی کتاب "دستور الفصاحت" (از احد علی یکتا) ہیں۔ اس میں شک نہیں مستقل تصنیف کی حیثیت سے اس معاملے میں فوقیت انہی بزرگوں کو حاصل ہے مگر غالباً اس سے انکار نہ کیا جاسکے گا کہ خان آرزو نے

مثمر اور نوادر میں قواعد اُردو کے اصول و مبانی کے متعلق متفرق طور پر جو اشارات کیے ہیں ان کو اس فن کی قدیم ترین اور اوّلین کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آرزو کا فکر و دماغ اپنی سب تصانیف میں محض قواعد صرف و نحو کی بجائے فقہ اللسان (فلالوجی) کے اصولوں کی دریافت اور انکشاف میں منہمک نظر آتا ہے۔ ان کا دائرۂ بحث صرف اُردو اور ہندی تک محدود نہیں بلکہ وہ ہندوستانی اور ایرانی زبانوں کے باہم خلط ملط اور فعل و انفعال کے راز معلوم کرتے رہتے ہیں۔ اس وسیع کوشش کے ضمن میں انھوں نے زبان اردو کے قاعدوں سے بھی کہیں کہیں بحث کی ہے جن کا مطالعہ محققِ زبان کے لیے بے حد مفید ہو سکتا ہے۔

نوادر الالفاظ میں زبان میں تصرفات کے قاعدوں، املا اور تلفظ کے قاعدوں اور ردّ و بدل کے دوسرے اسباب کے متعلق اشارات جن الفاظ کے ضمن میں آئے ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

"اسو، آفتادا، اوکسانا، انب، آنکس، باٹ موئی، باولی، بقچا، اوریب (اوریو) بگھار، بیرکھ، پوئیش، تسما، توتی، تھئی، ٹوپ، جمنا، جاگیر، جوہر، چکوا، چلا، خرچی، خشخت، دانت میں تنکا پکڑنا، سوارو، غلولا، فاختائی"

اُردو الفاظ کی املا کے متعلق آرزو نے یہ قاعدہ باندھا ہے کہ وہ لفظ جن کے آخر میں ایرانیوں کے نزدیک فارسی میں ہ آتی ہے جب وہ اُردو میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی املا میں وہ ہ الف سے بدل جانی چاہیے۔ چنانچہ چلا کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"... چلہ خود لفظ فارسی است غایتش ہندیان موافق لہجہ خود آں را بالف خوانند مثل چچا، بداں کہ ایں قسم لفظ کہ آخر آں ہائے مختفی بود فارسیاں آں را بہائے مختفی تلفظ کنند و ہندیان بالف مثل بنگالا و مالوا و روپیا کہ زر رائج ہندوستان است آنہا بنگالہ و مالوہ و روپیہ گویند و نویسند چنانچہ از کلام اساتذہ و محاورہ اہلِ زبان بثبوت رسید، پس در ہندی ایں قسم الفاظ را بہ ہائے مختفی خواندن غلط باشد و در فارسی بالف و آں چہ در عہد عالمگیری ایں قاعدہ برہم خوردہ بود و در دفاتر بنگالا و مالوا وغیرہ ہما بالف می نوشتند محض غلط و منشائے آں غفلت از تحقیق است۔"

(اس کے لیے لفظ بقچا کے علاوہ مثمر کے وہ حصّے بھی ملاحظہ کیے جائیں جہاں الف

اور ہائے مختفی کی بحث آئی ہے) ہمارے زمانے میں املا کی تسہیل کے سلسلے میں بہت کچھ بحث ہو رہی ہے۔ بعض اہل نظر کا خیال یہ ہے کہ بعض الفاظ جو بے ضرورت عربی یا فارسی تلفظ کے نیچے دب گئے ہیں ان کو از سر نو اردو والوں کے اصل مخارج کے قریب تر لایا جائے۔ عموماً اس قسم کی باتوں کو جذباتی رنگ میں سوچا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ آج بھی طیار لکھ کر اپنے خیالوں میں عربی زبان کی سرپرستی کر رہے ہیں مگر غرائب اور نوادر کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج سے بہت پہلے اُردو کے محققین نے اس معاملے میں ایک معقول اصول طے کر لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ املا اور تلفظ کے معاملے میں اہلِ زبان کے اپنے قدرتی مخارج اور لب ولہجہ کا ضرور خیال رکھنا چاہیے اور اس تکلف سے بچنا چاہیے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غرائب اور نوادر دونوں میں صوف کو سوف صابن کو سابن، چاقو کو چاکو، نقشہ کو نقشا غلولہ کو غلولا لکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کا یہ اصول آج بھی مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

آرزو جس زمانے میں نوادر کو مرتب کرتے ہیں اس میں الف زائدہ اور واو زائدہ کا رواج عام ہے۔ ڑ کی جگہ ڈ بھی موجود ہے۔ تلفظ میں چستی اور لطافت پیدا کرنے کے لیے حروف کے ترک و حذف میں ابھی وہ شدت نہ آئی تھی جس پر بعد میں بڑی سختی سے عمل ہوا۔ ابھی اُردو پُرانی اُردو (یعنی ہریانی، دکنی، پنجابی، راجستھانی ہندی) وغیرہ کے بہت زیرِ اثر ہے اور اس کا تلفظ ان ملے جلے اثرات کے تابع ہے۔ چنانچہ ذیل کی چند مثالوں سے اس خیال کی توضیح ہو سکتی ہے۔

اڈواڑ بجائے اڑواڑ۔ اساڈھ بجائے اساڑھ۔ باٹنا بجائے بٹنا۔ باندر بجائے بندر۔ باندھ بجائے بندھ۔ بجاؤنا بجائے بجانا۔ بڈبھس بجائے بڑبھس۔ بڈھنا بجائے بڑھنا۔ بنجھی بجائے بنسی۔ بھوکنا کتّے کا بجائے بھونکنا۔ بھیڈ بجائے بھیڑ۔ بھوکنی بجائے پھکنی۔ پیڈو بجائے پیڑو۔ ساتو بجائے ستو۔ تاپ بجائے تپ۔

ممکن ہے کہ ان میں سے بعض شکلیں کاتب کے اپنے طریقِ املا کے زیرِ اثر بگڑ کر درج ہو گئی ہوں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں اکثر آرزو اور ہانسوی کی اختیار کردہ ہیں جس کی توثیق یا تو لفظوں میں حروف کی ترتیب سے ہوتی ہے یا تلفظ کو بذریعۂ الفاظ ان مصنفوں نے خود قلم بند کر دیا ہے۔

نوادر الالفاظ کے مضامین کی اس مفصل اور مبسوط تشریح سے اس کتاب کی اہمیت

کا کافی ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ آرزو نے اپنی زبردست شخصیت سے نہ صرف اپنے عصر کو متاثر کیا بلکہ بعد میں آنے والی ادبی اور علمی تحریکوں پر گہرا اور نمایاں اثر ڈالا۔ انھوں نے فارسی اُردو ادب شناسی کے اصول قائم کیے انھوں نے ریختہ کے فن کو بے وقاری کے گڑھے سے نکال کر عظمت اور قبولِ عام کے کوچے سے آشنا کیا انھوں نے فقہ اللغہ کی بنا رکھی۔ انھوں نے زبان کے صرفی اور نحوی قاعدوں کے اصول وضع کیے، اور بالآخر یہ کہ انھوں نے اُردو لغت نگاری کا وہ اسلوب قائم کیا اور اس کے لیے ایک ایسی بنیاد اٹھائی جس کا آئندہ کی لغت نگاری پر گہرا اور دیرپا اثر ہوا۔

(بہ شکریہ اخبارِ اردو، اسلام آباد)

لمعاتِ بصیرت

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

قدیم درویش راجہ شاعر بھرتری ہری کے نیتی شتک، شرنگار شتک اور ویراگیہ شتک کا سنسکرت سے براہِ راست مکمل اور منظوم ترجمہ۔ کہنہ مشق بزرگ شاعر رگھوناتھ گھئی کی دس سالہ عرق ریزی کا نچوڑ۔ ہندستان کی قدیم دانش کا شاعرانہ اظہار۔

قیمت : 40 روپے

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ا، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006
فون : 6103381, 6103938, 6179657 فیکس : 6108159
حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

تاریخِ ادبِ اُردو

(۱۷۰۰ء تک)

(جلد اوّل تا پنجم)

(مع اضافہ)

پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین

☆ عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ۔
☆ محققین، اساتذہ، اہل علم و قلم، طلبہ اور عام اُردو داں حضرات کے لیے ایک بہترین تحفہ۔
☆ لائبریری اور دیگر اداروں کی اہم ضرورت۔
☆ یہ تاریخ نہیں دستاویز ہے۔

جلد اوّل	صفحات	462	قیمت	170	روپے
جلد دوم	صفحات	527	قیمت	170	روپے
جلد سوم	صفحات	467	قیمت	170	روپے
جلد چہارم	صفحات	431	قیمت	170	روپے
جلد پنجم (مع اضافہ)	صفحات	443	قیمت	170	روپے

جو خریدار یا کتب فروش یکم جولائی 99 سے پیشتر یہ سیٹ خرید چکے ہیں کونسل سے مفت ضمیمہ طلب کر سکتے ہیں جو جلد پنجم کے تیرہویں باب پر مشتمل ہے۔

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ ۱، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006
فون : 6179657, 6103938, 6103381 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

نظام الدین ایس گوریکر

آغا حشر کی ایک نایاب نظم
'شکریۂ یورپ'

آغا محمد شاہ کاشمیری متخلص بہ حشر (1876-1935) کشمیر الاصل اور آغا حشر کے نام نامی سے موسوم ہیں۔ وہ اردو ادب کے کرسٹوفر مارلو (Cristopher Marlowe) اور ہندوستانی ڈرامے کے ولیم شیکسپیر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

اپنی طالب علمانہ زندگی ہی سے آغا حشر کو ڈرامہ اور شاعری سے انتہائی شوق و شغف تھا۔ وہ ڈرامے لکھتے اور ڈراموں میں حصہ بھی لیتے، شعر کہتے اور مشاعروں میں چھپ چھپ کر شریک بھی ہوتے، اس زمانے میں ایک طرف منشی ونایک پرساد طالب، امانت لکھنوی، مرزا نظیر بیگ اور رونق بنارسی جیسے کہنہ مشق ڈرامہ نگار تھے تو دوسری جانب پنڈت نرائن پرساد بیتاب اور مہدی حسن احسن جیسے نوجوان ڈرامہ نویس تھے۔ آغا حشر کو ان حالات میں اپنا راستہ الگ بنانا پڑا اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اپنی انفرادی قابلیت کی وجہ سے ڈرامہ نویسی میں قبولیتِ عام کی سند حاصل کی۔ بمبئی کے قیام کے دوران منشی تجمل حسین جیسے ممتاز شاعر اور ان کے شاگرد شعرا اور رفقائے کار سے آغا حشر کا رابطہ قائم ہوگیا اور مشاعروں میں شریک ہوکر اپنا کلام سنانے لگے۔ اتفاق سے ایک روز ایک مشاعرے میں آغا حشر کے کلام اور ان کے زبان و بیان پر اعتراضات کیے گئے اور خوب نوک جھونک ہوئی۔ اگرچہ آغا حشر نے اعتراضات کے خاطر خواہ جوابات بھی دیے لیکن اس افسوسناک واقعے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے احساسِ کم علمی کے پیشِ نظر اصولِ بیان اور قواعد اُردو کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا اور زبان و بیان پر قابو پالیا۔ اس وقت مرزا داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا اور شعرائے اُردو حلقۂ داغ میں داخل ہونے میں مسرت ہی محسوس

نہ کرتے بلکہ سعادت تصوّر کرتے تھے۔ آغا حشر نے بھی مرزا داغ سے رشتہ جوڑ لیا۔ آغا حشر کا اسلوبِ سخن منفرد اور بے مثال ہے۔ سلاست و روانی اور برجستگی و برجستگی کے ساتھ ساتھ ان کے شعروں میں بندشِ الفاظ اور جدّتِ تراکیب نمایاں ہے، حرکت و عمل کا جوش بھی دکھائی دیتا ہے۔

اشعارِ ذیل میں آغا حشر کے زورِ بیان اور طرزِ انشا کو دیکھیے:

دنیائے بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے ہر صبح کی ہے شام

گردلوں میں اتّفاق اور خواہشوں میں میل ہے
زندگی کی راحتوں کو فتح کرنا کھیل ہے

ہزاروں دوست بن جاتے ہیں اکثر خوش نصیبی میں
مگر وہ دوست ہے جو ساتھ دے دُکھ اور غریبی میں

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

نہ زندگی ہے ہمارے بس میں نہ موت ہی اختیار میں ہے
کسے بنانا کسے مٹانا یہ قبضۂ کردگار میں ہے

آسودگیِ روح ، نشاطِ نظر نہیں
دُنیا میں کچھ نہیں ہے محبت اگر نہیں

آغا حشر کی نظموں میں 'موجِ زم زم' اور 'شکریۂ یورپ' کافی مقبول ہوئیں 'شکریۂ یورپ' (جو شاہکار تصور کی جاتی ہے) وہ نظم ہے جو آغا حشر نے اپنے دورانِ قیام شمس العلما حکیم فقیر محمد چشتی کے عشرت کدے پر ان کے اصرار پر چند گھنٹوں میں فی البدیہہ لکھی۔ یہ نظم مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی حکیم صاحب کی ایما پر اسی وقت اس کی کتابت کروائی گئی اور مرغوب ایجنسی لاہور نے اسے شائع کیا اور دوسرے

روز جمعہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو آغا حشر نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھائیسویں سالانہ جلسے میں یہ نظم مترنم آواز میں پڑھی اور سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ اس نظم 'شکریۂ یورپ' میں آغا حشر نے مسلمانانِ عالم کے اضطراب دروں کا اظہار کیا ہے' یہ نظم نہ صرف بصیرت آموز ہے بلکہ ایمان افروز بھی اور ندرتِ خیال اور جدتِ فکر کا دل پذیر نمونہ بھی۔ ذیل کے بند کو باغیانہ تصور کر کے حکومتِ برطانیہ نے اس نظم کو قابلِ ضبطی قرار دیا اور اپنے حکم نامہ کے تحت اس بند کے خارج کرنے کی تاکید کی اور بالفعل دوسری اشاعت میں اس بند کو خارج از نظم کیا گیا ہے۔

اے زمینِ یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے
خونچکاں، رودادِ اقوامِ گریباں چاک ہے
صرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا
جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اُٹھ رہا ہے سوزِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے
بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے سراید بلبلے

اس نظم کا پیش لفظ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے نظم اور پیش لفظ دونوں یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ آغا حشر جہاں شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار اور قادر الکلام شاعر ہیں وہاں انھوں نے ایک دیندار مسلمان کی حیثیت سے مبلغ اسلام کا رول بھی ادا کیا ہے۔ ان کے زمانے میں شدھی، سنگٹھن اور عیسائیت کا ابلاغ زوروں پر تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، خواجہ حسن نظامی اور آغا حشر کاشمیری کبھی انفرادی طور پر اور کبھی مل کر آریہ سماج کے رضا کاروں اور عیسائی مشنریوں سے مناظروں میں حصہ لیتے تھے لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد کاروباری اور دیگر مصروفیتوں کے پیشِ نظر آغا حشر نے اس مشن سے اپنے کو الگ کر لیا۔

اس امر کا اقبال کرنا ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابچہ مجھے اپنے محسن اور بزرگ جناب عباس دلال صاحب کے ذاتی کتاب خانے میں ملا۔ جنھوں نے آغا حشر سے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دلال صاحب کے والد بزرگوار جناب اکبر علی دلال صاحب الیگزینڈر تھیٹریکل کمپنی (Elexandra Theatrical Company) کے مالک تھے اور بمبئی کے دورانِ قیام میں آغا حشر کے ان سے گہرے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کا تحریر کردہ پیش لفظ :

کاشمیری آغا حشر نے 'شکریۂ یورپ' کے نام سے جو نظم لکھی وہ شاعرانہ تخیّل اور فکر و ذہن کی احسان مند نہیں ہے، اس کو محض نظم کی حیثیت سے سننا اور پڑھنا ظلم ہے کیونکہ اس میں جو کچھ ہے وہ مسلمانانِ عالم کے اضطرابِ درونی کا اظہار ہے۔

آغا حشر میرے ہندوستان کے، اردو زبان کے، پرانی جان پہچان والے ہیں جن کو خدا نے اس صدی کا بے مثل ہندوستانی ڈرامانویس بنا کر بھیجا۔

یورپ اپنے شیکسپیئر پر فخر کرتا ہے جو بیکن کا گراموفونی ریکارڈ تھا تو ہندوستان کو آغا حشر پر ناز ہے جس کی کارگزار طبیعت کسی بیکن کی رازدارانہ اعانت کی زیربار نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی اسٹیج پر آغا کا یہ پہلا پارٹ ہے۔ اگر پہلا وار ہے تو واقعی بھرپور ہے۔ نظم کے تیور، الفاظ کی بندش، نرالی اور انوکھی روش، سب گواہ ہیں کہ یہ نظم قیامت ہے یا قربِ قیامت کی نشانی۔

یورپ کو اگر ایشیا کے ستانے، مسلمانوں کو ٹھکرانے میں مزا آتا ہے تو ہم کو آغا حشر کے اس طمانچے سے لطف حاصل کرنا چاہیے جو رخسارِ سفید پر دستِ سیاہ سے مارا گیا

ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کہ جناب مسیح کے پیرو انجیل کے قول پر عمل کر کے دوسرا رخ بھی سامنے کر دیں اور اس شاعرانہ شکریے کے نازک ہاتھ کے بدلے کسی وحشی کوہستانی کا ہاتھ سامنے آجائے۔

آغا حشر نے اردو ڈراموں کے ذریعے ہندوستان اور اردو زبان کی اتنی بڑی خدمت کی ہے اور وہ ایک ایسی چلبلی البیلی مگر فلسفیانہ طبیعت لے کر آئے ہیں جس کی داد نیم بیدار ملک سے ملنی دشوار ہے۔

ذرا خدا لگتی کہنا اور حشر کی اس نظم کو دیکھنا۔ لفظوں اور معانی کے تشکر ناآشنا میدانوں میں کس شان سے چڑھ کر آتے ہیں۔ طبع مسلم کے کمانڈر نے کیسی ہوش ربا مورچہ بندی کی ہے۔

شیکسپیئر کو قبر کے اسٹیج سے بلانا، ایشیا کے محشرستان میں صور کی آواز سنے، مقتولین کی کفن کشائی دیکھے۔

جو مسلمان دم توڑ رہا تھا، موت کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا، اس کو عیسائی کی بے رحم ٹھوکر نے مارنے کی جگہ جلا دیا، زہر کا گھونٹ آبِ حیات بن گیا، بجھی ہوئی راکھ کو ٹھنڈا اور ملیا میٹ کرنے کی کرید نے ایک چنگاری نمودار کر دی۔

حشر کے ایشیائی دل نے اسی واسطے جفا پیشہ یورپ کا احسان مانا ہے شکریہ ادا کیا ہے کہ نہ تو ایسا کرتا نہ ہماری بیداری و احساس کی تیغ میان سے کھینچتی۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی احرار اس لطیف و پرمعنی نظم میں اپنے درد کی دوا نہیں تو تیمارداری کی سراپا تسلی ادائیں تو بہت سی پائیں گے اور جنابِ حشر سے تقاضا کیا جائے گا کہ وہ اسی قسم کی گرجتی، برستی نظمیں اور لکھیں تاکہ دلوں کی خشک سالیاں دور ہوں۔

اس شکرانے اور تھینکس کا جواب شائستہ اور مہذب یورپ کی طرف سے بتقاضائے تہذیب ضرور ہونا چاہیے۔ میں نہیں جانتا کہ قصوروار یورپ کیونکہ ایشیا سے آنکھ سامنے کر کے اس "تھینکیو" (Thank You!) کے جواب میں "ڈونٹ منشن پلیز" (Don't mention please!) کہہ سکے گا۔

نظم 'شکریۂ یورپ' کا یوں تو ہر مصرع کوہ آتش فشاں ہے مگر آخر کی دعا نہایت موثر اور آدمی کے خاکستانی پیکر میں ہل چل ڈالنے والی ہے جس کا جواب انھی حضوفا [illegible] ایک

آنکھ کو یہ منقوش نظر آیا۔

جناب آغا اور سب مسلمانوں کو اطلاع دو کہ اس کو یاد رکھیں۔

سلام قولا من رب الرحیم

یعنی رحمت والا پروردگار سلامتی کا قول دے چکا ہے تو پھر مسلم حق پرست کیوں ہراساں ہوتا ہے۔

جب تک حق ہے حقدار سلامت رہے گا

شکریہ یورپ

از آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا
سازِ ہستیِ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی
شعلہ ریزیِ نواہائے اخوت سرد تھی
کر چکا تھا اپنی ہستی مسلمِ پرجوش گم
گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشر خاموش گم
ماضیِ رنگیں تماشہ حیرتیِ حال تھا
وہ نگار جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا
آمد و رفتِ نفس لاتی تھی پیغامِ حیات
ورنہ نذرِ خود فراموشی تھا ناکامِ حیات
چشمِ بینا حیرتِ طفلانہ کا گہوارہ تھی
صرفِ تعمیرِ تحیر طاقتِ نظارہ تھی
نغمہ سنجِ قدس چپ تھا، گلشنِ تکبیر میں
بند تھا شورِ انا مسلم لبِ تقریر میں

مدفنِ صد جلوۂ آشوب زا آئینہ بود
یک جہانِ بیقراری دم بخود در سینہ بود

وہ پیامِ آخری اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہورِ صدق جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلی حقیقت جو ضلالت سوز تھی
گرمیٔ قلبِ محمد سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالمتاب نے
زنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا
سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیے خاکسترِ افسردہ میں
زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں
شورشِ ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈال دی
شور بادل کا، تڑپ بجلی کی دل میں ڈال دی
ایک ہلچل پڑ گئی جذباتِ زنگ آلود میں
آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں

بارہا نالید و گفت اے قوم بیدار شو
حصۂ خود از حریفاں گیر و کرم کار شو

پُر ز غوغا شد جہاں شورم ز ہفت اختر گذشت
پنبہ در گوشی چرا؟ برخیز کآب از سر گذشت
مایۂ صد آفت است ایں گوش ناشنوائے تو
ہوش کن زامروز گردد خوار تر فردائے تو
شرم کن محو ادائے کفر ساماں کردۂ
آں دل و جانے کہ اول نذرِ قرآں کردۂ
اے کہ فطرت نرم و ہمت بچو آہن داشتی
قطرۂ بودی، مگر طوفاں بدامن داشتی

پرکن از صہبائے دوشیں ساغرِ ایّام را
باز رنگِ جلوہ دہ از صبح ماضی شام را
صرفِ نسیاں ہیبتِ غرناطہ و بغداد شد
باز برخواں آں سبق کو خلق را از یاد شد
سطوتِ فاروق بنما شیوۂ حیدر بگیر
تاج از کیسر ستان و باج از قیصر بگیر
حال و استقبال ہر دو حاصلِ تدبیرِ تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دستِ تو تعمیرِ تست

ہاں جھٹک پیشانیِ ظلمت پہ افشانِ سحر
ٹانک دے دامانِ شب میں پھر گریبانِ سحر
بہرہ ور کر دل کو سوزِ احمدِ بے میم سے
جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قرباں گاہ کو
زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو
ڈال دے شورِ نوا معمورۂ ظلمات میں
دوڑ جا آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
خاک کو بھر دے سرورِ آسماں پرواز سے
گرم کر دے روحِ مستی شعلۂ آواز سے
حسنِ آرائش سے زینتِ عالمِ امکاں کو دے
خلعتِ تجدید آئینِ کہن ساماں کو دے
کلیاتِ دہر کی اک شرح تو تحریر کر
نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر
طرحِ نو انداز و بنیادِ جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہنِ آتش بخشک و تر فگن

تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی

آج ان ذرّوں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

منتظر نظّارے ہیں چشمِ خمار آلود کھول
اُٹھ کلیدِ فتح بن قفلِ درِ مقصود کھول

اے خوشا غفلت جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں

گو صدائے ہمّت افزا تا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر پیہم آوازِ سروش آتی رہی

پھر بھی ننگِ زندگی آسودہ خواری رہا
سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا

جب تغافل اپنا شیوہ خفتہ قسمت نے کیا
اور ہی سامانِ بیداری مشیت نے کیا

دفعتاً از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شد
قم باذنی گفت مغرب روحِ مشرق زندہ شد

اے زمین یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز

چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے

اشکِ حسرت زا سے چشمِ حرّیت نمناک ہے
خونچکاں رودادِ اقوامِ گریباں چاک ہے

صرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری

عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا
جنّتِ دنیا کو دوزخ کا نمونا کر دیا
اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزے نے سراید بلبلے

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
اُمتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذتِ ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ بشکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خونِ تنِ بیجاں میں ہیجان آگیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفان آگیا
چونک اٹھی روحِ اخوت، ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں، گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
مل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے

از کرم بپذیر یارب جوش بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار ایں زندگی تازہ را

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے
اے دعا ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رخ گردشِ ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپئے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کے لیے
کر رہے ہیں زخم دل فریادِ مرہم کے لیے
رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

ہندستان کے سب سے بڑے ادبی انعام "سرسوتی سمان" سے سمانت

شعرِ شور انگیز (دوسری طباعت)

جلد اوّل :	صفحات ۷۱۲	قیمت ۱۵۰/- روپے
جلد دوم :	صفحات ۵۱۷	قیمت ۱۳۰/- روپے
جلد سوم :	صفحات ۶۹۷	قیمت ۱۵۰/- روپے
جلد چہارم :	صفحات ۸۱۰	قیمت ۱۷۰/- روپے

میر شناسی کی دستاویزی حیثیت کی کتابیں میر کی شاعری کا بھرپور جائزہ اور تجزیہ خود مصنف کی زبان میں ان کتابوں کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میر کی غزلیات کا ایسا معیاری انتخاب جو دنیا کی بہترین شاعری کے سامنے بے جھجک پیش ہو سکے اور جو میر کا نمائندہ انتخاب بھی ہو۔

۲۔ اُردو کے کلاسیکی غزل گویوں بالخصوص میر کے حوالے سے کلاسیکی غزل کی شعریات کی بازیافت۔

۳۔ مشرقی اور مغربی شعریات کی روشنی میں میر کے اشعار پر تجزیہ تشریح تعبیر اور محاکمہ۔

۴۔ کلاسیکی اُردو غزل فارسی غزل علی الخصوص سبک ہندی کی غزل کے تناظر میں میر کے مقام کا تعین۔

۵۔ میر کی زبان کے بارے میں نکات کا حسبِ ضرورت بیان۔ کتاب کے مصنف جناب شمس الرحمان فاروقی کو اس کتاب کی بنا پر ۵ لاکھ روپے کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی پہلی طباعت ختم ہو چکی ہے۔ دوسری طباعت مکمل ہے۔

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک-۱، ونگ-6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-006 110

فون : 6103381, 6103938, 6179657 فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد-500002

بشیر احمد

اپ بھرنش اور اُردو

اپ بھرنش تمام جدید ہندوستانی زبانوں کا مشترکہ ورثہ ہے اسی لیے بجا طور پر تمام جدید ہندستانی زبانوں کے مورّخ اپ بھرنش کو ان زبانوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اپ بھرنش کا دَور آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی پر محیط ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں میں (۱) آسامی (اسمیہ)، (۲) اُڑیا، (۳) گجراتی، (۴) بنگلہ، مراٹھی، (۶) سندھی، (۷) پنجابی، (۸) اُردو، (۹) ہندی، (۱۰) راجستھانی، ہریانوی، برج، بھوج پوری شامل ہیں۔

اپ بھرنش کے بارے میں مورّخین کا کہنا ہے کہ مقامی زبانوں سے آریاؤں کی زبان کا تال میل ہوا جس سے ویدک بھاشا ظہور میں آئی اور ویدک بھاشا تین حصّوں میں بٹ گئی (۱) ادکیہ پنجاب کی زبان تھی۔ (۲) مدھیہ پردیشی برج اور دہلی وغیرہ کی زبان تھی۔ (۳) بہار اور بنگال کی زبان پراچیہ کہلائی۔ اسی عہد میں ویدک بھاشا کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے صرفی و نحوی قواعد بنائے گئے اور زبان کو صاف ستھرا کرکے اسے سنسکرت (صاف ستھرا) نام دیا گیا۔ اور یہ زبان برہمنوں کی میراث بن گئی۔

عوام تعلیم یافتہ نہیں تھے لہٰذا سنسکرت پر اُن کا حق نہ تھا وہ ہمیشہ کی طرح مقامی بولیاں بولتے رہے۔ لسانی مورّخین انھیں پراکرت کا نام دیتے ہیں۔ پراکرت کی بہت سی قسمیں تھیں مگر پانچ پراکرت اپنے علاقوں کے اعتبار سے مشہور ہیں۔ (۱) پشاچی (۲) شورسینی (۳) مہاراشٹری، (۴) ماگدھی اور اودھ ماگدھی۔ ان پراکرتوں کے بھی قواعد اور اصول و ضوابط بنائے گئے۔ مگر عوام ان ضابطوں سے بے نیاز اپنی زبانیں بولتے رہے۔ مورّخینِ لسانیات نے انھیں اپ بھرنش کا نام دیا ہے۔ اپ بھرنش کی پانچ قسمیں تھیں جو علاقائی نسبت سے مشہور ہوئیں۔

یہ اپ بھرنش آٹھویں صدی سے بارھویں صدی پر محیط ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کا ہندوستان میں ورود ہوتا ہے اور تیرھویں صدی تک ان کی حکومت ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں پر قایم ہو جاتی ہے۔

اپ بھرنش کے ۸۴ مصنفین کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء میں پنڈت ہرپرشاد شاستری نے نیپال میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ کلام بدھ سدھیوں کا ہے اس مجموعے کا نام "چرچاچرجانی شچے" ہے مگر یہ کتاب بدھ گان دوہا کے نام سے معروف ہے۔ اس میں پدوں کے علاوہ مختصر نظمیں بھی ہیں یہ کتاب اصل مسودہ کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں بنگالی رسم الخط میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب کا باضابطہ تعارف جناب شبیر علی کاظمی نے اردو دنیا سے کرایا، اور اسے پراچین اردو کا نام دیا۔

چرجا روزمرہ کے گیتوں کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس سے بدھ گوتیے مراد لیے جاتے ہیں۔ مولانا داؤد نے چنداین میں کہا ہے۔

"نیہہ چارجا گاؤئی چھورئی"

شبیر علی کاظمی نے بدھ گان ودوہا کے سینتالیس پدوں کا اردو متن، لفظی ترجمہ، مشترکہ عناصر اور توضیحات وغیرہ کے علاوہ ایک مفید تعارفی مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے "پراچین اردو" کے نام سے ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

بدھ گان دوہا اگرچہ بنگالی رسم خط میں شائع ہوئی تھی مگر سدھیوں کے پرگان یا دوہے ملک بھر میں علاقائی تبدیلی کے ساتھ دستیاب ہیں اور ان دوہوں کو اسمیا، گجراتی، اڑیا، بنگلہ، مراٹھی، سندھی، پنجابی اور ہندی کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں کے مورخین نے اپنی اپنی زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اپ بھرنش کو اپنے لسانی سفر کی ایک منزل قرار دیا ہے۔ ان میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) اسمیا بھاشا

اسمیا بھاشا کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے جھگن لال جین لکھتے ہیں ماہرین لسانیات

کی رائیوں کے مطابق اسمیا زبان کا ارتقا بنگلہ، اڑیا، میتھلی کی طرح مگدھی اپ بھرنش سے ہوا۔ دسویں صدی سے پہلے کے شیلا لیکھوں (کتبوں) سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں کی راجیہ بھاشا سنسکرت تھی۔ اونچے طبقے کے لوگ سنسکرت ہی لکھتے بولتے تھے۔ اور عوام کا وسیلۂ اظہار مگدھی پراکرت تھی۔ اس زمانے کے اَسَم یعنی کامروپ راجیہ میں مگدھی پراکرت کا مروج روپ کامروپی پراکرت کے نام سے مشہور ہے۔ لہٰذا مانا جاتا ہے کہ اسمیا (آسامی) بھاشا کامروپی پراکرت یا مگدھی کے مروجہ اپ بھرنش سے پیدا ہوئی۔
اسمیا بھاشا پر تبتی، برمی اور آسٹرک زبانوں کا بھی اثر ہے۔ اسمیا کے لفظی ذخیرے میں غیر آریائی زبانوں کے علاوہ سنسکرت اور دوسری ہند آریائی زبانوں کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔
ساتویں صدی کے نصف اوّل میں چینی سیاح ہوانگ سانگ ہندوستان آیا تھا اس نے بتایا کہ " درمیانی ہندوستان کی عوامی بھاشا سے کامروپ کی عوامی بھاشا ملتی جلتی ہے۔
ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں: "اسامی اپنی آزاد راجیہ اور سماجی ماحول کے دائرے میں ترقی پذیر ہوئی۔ تقریباً تین چار سو برسوں تک صرف بول چال کی زبان رہی۔ تیرھویں صدی میں اس نے ادبی روپ اختیار کیا۔"
اسمیا زبان کے قدیم دور میں بیراگی بھکتوں کے گیتوں، بودھ سدھیوں کے دوہوں اور مین ناتھ، مست تیندرناتھ، لوہی پاد، سرہ پاد وغیرہ کے گیتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ شعری تخلیقات میں پہیلیوں کا بھی خاص مقام تھا۔ آسامی زبان کے قدیم نمونوں کی چند مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) تری لوکیئے کنیا مہا روپ وتی
سندر نایکا دنت مکوتار بتی
منال مرگال ہوکرش مدھیہ دیش
کمل نئے نی انکو چت کیش

(۲) اَبھر دھن جن جیون یووَن
اَبھر اِہو سنسار۔

پتر پری وار سب ہی اَتّار
کرے لُو کا ہے ری سار
کمل دت پل چتر چنچل
چر نہیں تل اک
نہیں بھو بھئے بھورے ہری ہری
بر بجھ پد پر تیک

(۲) اُڑیا بھاشا

اڑیا زبان کے ماہر لسانیات ڈاکٹر بنشی دھر موہنتی اڑیا زبان کی ترقّی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ماہرین زبان کی ادا کے مطابق پوربی مگدھی سے صرف اڑیا ہی نہیں بلکہ بہاری، بنگلا اور آسمیا وغیرہ زبانیں نکلی ہیں" وہ مزید لکھتے ہیں" قدیم اڑیا زبان کی ترقی کا زمانہ متعین کرتے وقت ہمیں پہلے بودھ گان دوہا کے بارے میں غور کرنا ہوگا۔

سدھ ساہتیہ پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کنہو پاد، شبر پاد، لوہی پاد، جالندھر، کمبل، راہول بھدر، استی دھن وغیرہ ۶۰۰ عیسوی سے ۱۰۰۰ عیسوی تک محیط ہیں۔ اور ان کے دوہے کسی ایک زمانہ اور ایک علاقہ تک محدود نہیں۔

بودھ گان دوہا کی زبان قدیم اڑیا زبان کے خط وخال سے ملتی ہے جن بودھ سدھیوں کے یہاں زبان کا یہ قدیم روپ ملتا ہے ان میں سے چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

لوہی پا، بین ناتھ، گورکھ ناتھ، شیوا یپا، کمل رو پا، کن ہو پا اور ہاری پا۔

ڈاکٹر بنشی دھر موہنتی نے سدھی ادب کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

ایک سیلے ہوئی دوئی الگ ولگ
نرہوں، نرانتر سے ہو الگ
سی شومنا مدھیئے سیوتی پرکاش
دندنی ناتھے یے ہی سدھنکر وشواس

وندے گری اُسی گری پشیا گری میلا
ہستی چرائی بہوت مالا
یے ون سے ہستی مہارس کھائی
وینی پچھی چھید یلے گگنے سمائی

"وشنو دیو"

(۳) گجراتی بھاشا

گجراتی زبان کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر چندر کانت مہتا لکھتے ہیں:

"ویدکال کی بھاشا سے علاقائی خصوصیات کی حامل مختلف پراکرتک بھاشاؤں کا آغاز ہوا جن میں شورسینی بھی ایک تھی۔ شورسینی سے اپ بھرنش کا آغاز ہوا جس سے آریا خاندان کی موجود زبانیں ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگلہ وغیرہ پیدا ہوئیں"۔ بارھویں صدی سے سولہویں صدی تک گجرات، مارواڑ اور راجستھان میں جو بھاشا مروّج تھی اسے ڈاکٹر ٹے سی ٹوری قدیم پچھمی راجستھانی کہتے ہیں اور نرسنگھ راؤ دو یٹیا اسے آخری اپ بھرنش کہتے ہیں۔ پندرھویں صدی سے گجرات کا راجستھان کے ساتھ تعلّق ٹوٹ گیا سولھویں صدی سے گجرات راجستھان سے سیاسی طور پر الگ ہوگیا۔ گجرات میں آزاد مسلمانی اقتدار قائم ہوگیا اور اس طرح سیاسی وجوہ سے گجراتی اور راجستھانی الگ الگ بھاشائیں ہوگئیں۔

گجراتی کے ابتدائی دور میں سدھی شالی بھدر سوری، ونے چندر سوری سوم سندر، ہری بھدر سوری، رشبھ داس کے نام آتے ہیں۔

(۴) بنگلہ بھاشا

بنگلہ زبان کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اندرناتھ چودھری لکھتے ہیں: قدیم زمانے میں ہندوستان کے پوربی حصّے میں قدیم آریا زبانوں کی آمد سے پہلے آسٹرک گروہ کی ذیلی زبانیں، کول منڈا وغیرہ مروّج تھیں دسویں صدی ق م میں ان علاقوں میں آریا زبانوں کی آمد ہوئی۔

آریوں کی ویدک بھاشا۔ مقندو بھاشا تھی اس کے اثر سے یورپ کی ایک ریاست
جہاں آسٹرک ذات کی ذیلی ذات تیبُوآہ رہتی تھی بنگ کے نام سے مشہور ہوئی اور اس
ریاست میں رہنے والوں کو بنگلہ کہنے لگے۔ پوران میں بنگ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا
ہے کہ چندر نسل کے بلی نام کے ایک راجہ ہوئے ان کے پانچ لڑکے تھے ایک کا نام بنگ تھا
اسی کے نام سے یہ ریاست مشہور ہوئی۔

تقریباً پانچویں صدی ق م میں بنگال میں آریا بھاشا کی دوسری لہر آئی ۔ یہ درمیانی
ہندوستان کے آریوں کی زبان تھی اس میں کول، منڈا، دراوڑ اور تبت براہمن گروہ کے
الفاظ کی کثیر تعداد شامل تھی۔

آٹھویں، نویں صدی میں اپ بھرنش بھاشاؤں کا ظہور ہوا۔ بنگالی اپ بھرنش
سے تین بھاشاؤں کا جنم ہوا ان میں اسمیا، اڑیا اور بنگلہ زبانیں شامل ہیں۔

بنگلہ کا قدیم دور دسویں صدی سے چودھویں صدی تک پھیلا ہے۔ اس میں آسامی،
اڑیا اور قدیم بنگلا خلط ملط طور پر موجود ہیں۔ ترکوں کے حملے اور اقتدار میں آنے کی وجہ
سے عربی فارسی الفاظ بکثرت شامل ہونے لگے اور میتھلی زبان کا اثر بھی بڑھا۔

بنگال میں قدیم بنگلہ ادب کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بودھ سدھوں کا بڑا ہاتھ ہے
جو بارھویں صدی تک بنگال میں پھیلے ہوئے تھے۔

بنگلہ ادب کے نقوش اور ہندی ادب کے نقوش ابتدائی طور پر بہت حد تک
مشترک ہیں۔

ہرپرساد شاستری نے بودھ گان یا چریا پاد شائع کر دیا ہے اس میں ۴۷ گیت ہیں ان
کے خالقوں میں لوئی پاد، کنو پا، بھوسک شامل ہیں۔ نمونۂ کلام مندرجۂ ذیل ہے:

مت ترو پانچ اندری تسو ساہا
آسا بہل پات پھل واہا
برگرو۔ بعض کٹھوریں چھی عن

یعنی من کے درخت کی پانچ شاخیں پانچ عضو ہیں۔ آشا (امید) اس کے پتّے ہیں
پھل بھی ہیں۔ اعلیٰ پیر کے اقوال کی کلہاڑی سے اسے کاٹ ڈالو۔ کہن کہتے ہیں اس درخت
کو کاٹ ڈالنے سے پھر جنم نہیں ہوتا۔

(۵) مراٹھی بھاشا

مراٹھی زبان کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر پربھاکر ماچوے لکھتے ہیں :

مراٹھی کا سب سے پہلا تحریری روپ چکر ڈے گرام (ضلع ستارا) میں ۱۳۶۷ عیسوی کا لکھا تامر پٹ ہے۔ اس تحریر کے افعال کی شکل مرہٹ بھاشا کی ہے۔ ۹۸۳ عیسوی کا شرون بیل گولا کا شلالیکھ (کتبہ) بھی قدیم مراٹھی کی ایک شکل ہے۔ گیارھویں صدی کے بیش چندر جینی پنڈت نے "راج منی پربودھکھی اس میں مراٹھی کے الفاظ ہیں۔ تیرھویں صدی میں گیانیشوری جیسا گرنتھ لکھا گیا۔

عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مراٹھی میں عربی فارسی الفاظ کی بکثرت آمد ہوئی۔ نام دیو (۱۳۵۰ - ۱۲۷۰) کے علاوہ ایکناتھ، مکتیشور تکارام اور' رام داس نے مراٹھی کو بڑھاوا دیا۔

ناتھ پنتھی سادھوؤں نے بھی اسے بڑھانے میں حصّہ لیا۔ ناتھ پنتھی رمتے جوگی تھے کبھی یہاں کبھی وہاں ان کی زبان پر جگہ جگہ کے اثرات تھے۔ مہاراشٹر میں گہنی ناتھ نے نی ورتی ناتھ دگیانیشور کے بڑے بھائی) کو جو سبق دیا اس میں دھیان یوگ کے ساتھ ساتھ کرشن بھگتی یا اپاسنا مارگ بھی دکھایا۔ ویدک دھرم کے سناتن چتوان اور دیوبانی کے خلاف لوک وانی کا پرچار کرنے والے ناتھ پنتھی سادھی (سدّھی) نے مراٹھی شاعری کی بنیاد رکھی۔

ہرپال دیو (پیدائش ۱۲۲۰) نے جو گجراتی تھے۔ مہاراشٹر آکر سدھی گنڈم راول (گووند پربھو) سے ملے اور ان کے زیرِ اثر اپنا نام چکر دھر رکھ لیا۔

(۶) سندھی زبان

سندھی بھاشا کی تشکیل اور ترقّی پر روشنی ڈالتے ہوئے موتی لال جوت وانی لکھتے ہیں :

ویدوں کی تخلیق کے وقت سندھ کی وادی میں پرانی بھاشائیں بولی جاتی تھیں پرانی بھارتی آریہ بھاشا کی مختلف بولیاں الگ الگ ریاستوں میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک بولی کو عالموں نے صاف ستھرا کر کے سنسکرت بنالیا۔

مدھیہ بھارتی آریہ بھاشا کی آخری منزل اپ بھرنش کہلاتی ہے۔ اسی اپ بھرنش سے مختلف جدید ہندوستانی زبانیں ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔

بھرت ناٹیہ شاستر میں لکھا ہے کہ ہمالیہ سے لے کر سندھو کے کنارے تک کی بھاشاؤں میں زیادہ تر الفاظ بگڑے ہوئے ہیں یہ خاصیت سندھی میں بھی ہے مثلاً گوپالو، کشورو، پڑھنو، لکھنو وغیرہ۔ یوانگ چوانگ (ہوانگ سانگ) نے لکھا ہے کہ سندھ کے لوگوں کی بھاشا مدھیہ پردیش کی بھاشا سے تھوڑی سی الگ ہے۔ مدھیہ پردیش میں اُتری گجرات، راجستھان، مالوا، پچھمی اُتر پردیش اور پڑوسی پردیش آتے ہیں۔ کوولیہ مالا کتھا میں پشاچ (پراکرت روپ پیسا یو) کو پیسایا کہا گیا ہے۔

آج کی سندھی بھاشا کی پیدائش پشاچی پراکرت کے براچڑ اپ بھرنش سے مانی جاتی ہے۔ براچڑ سندھو دیش میں بولی جاتی تھی سندھو دیش کو براچڑ دیش بھی کہتے تھے۔

سندھی کا قدیم عہد ۱۰۰۰ سے ۱۵۲۲ تک محیط ہے۔ سندھ میں ۷۱۱ میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تبھی سے یہاں دو رجحان ملتے ہیں ایک اسلامی رجحان ہے اور دوسرا اصل ہندوستانی۔ مسلمان چونکہ ہندوستانی تھے لہٰذا انھوں نے بھی اصل ہندوستانی دھارا سے خود کو زیادہ الگ نہیں رکھا۔ گیارھویں صدی کے اواخر میں راج پال ابن سومار نام کے ایک سومرا سردار کا ذکر ملتا ہے۔ گیارھویں صدی کے آغاز سے عربی حکومت کے خاتمے کے بعد سن ۱۰۵۰ عیسوی کے لگ بھگ سندھ کی حکومت کی باگ ڈور سومروں کے ہاتھوں میں آگئی۔ سومروں کا آخری راجہ ہمیر تھا۔ ۱۵۲۱ میں قندھار کے حکمران شاہ بیگ ارگون نے سما حکمران جام فیروز کو شکست دی۔ مگر اس نے جام فیروز کو سندھ کے زیریں علاقے پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۵۲۲ میں شاہ بیگ کی موت کے بعد اس کے لڑکے شاہ حسین نے فیروز حکومت کا خاتمہ کر کے سندھ سے مقامی حکمرانوں کے سلسلے کا خاتمہ کر دیا۔

دہلی کے سلطان علاؤالدین کے سپہ سالار ظفر خاں نے ۱۲۹۸ میں سندھ پر حملہ کیا۔ ہمیر سومرا اور اس کے بعد کے حکمرانوں کے درباروں میں بھاٹ گیت گاتے تھے اور راجاؤں کی قصیدے خوانی ہوتی تھی۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

سیجن کرکے سوجھ پر و ، دھدھنی دھودھوکار
آتے ابڑوای لے وڑے جہاں پانی بورے تار
بن تلمے بندگی کرے تو بندگی ٹنی سا س
جیون نتی آٹھ راہ چلنا ، آخر اجڑ واس

سندھی میں سدھی سادھوؤں کے علاوہ اسماعیلی مبلغوں کے دوہے بھی ملتے ہیں۔ سومرا عہد کے پہلے داعی سیّد نور علادین تھے جو اسماعیلی فرقے کے اٹھارویں امام کے حکم سے سن ۱۰۷۹ میں ہندوستان آئے۔ ان کے سندھی دوہے کا نمونہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ انھیں ست گرو نور بھی کہتے تھے۔ ان کے بعد غزنی کے سبزوار شہر سے پیر شمس (۱۲۸۰ - ۱۱۶۵) اور ایران کے پیر صدر الدین (۱۴۰۹ - ۱۲۹۰) آئے۔ آخر الذکر نے ویدانت کا مطالعہ کیا اور بڑی تعداد میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کے معتقد خواجہ کہلاتے تھے۔ انھوں نے سندھی کی ذیلی زبان کچھی میں دوہے کہے ہیں، نمونہ درج ذیل ہے:

کاشی جائی تھیں گنگا مانہہ نا ہو
تو آمنے تنے سرجیا سوکیوں تھے پاؤ؟

سندھی کے چند شعرا کا ضمناً ذکر کیا جاتا ہے (۱) شاہ کریم (۱۶۲۴ - ۱۵۳۶) ان کے ۹۵ بیت دستیاب ہیں نمونہ:

جاگو جاگو سوئی، جا ہیضہ ہیتھ بدھائی
تا سنی سیج پریں رسے۔ پنو پیاری نا ہیں

(۲) دادو دیال (۱۶۵۹ - ۱۶۰۱) انھوں نے اپنے زمانے کی مختلف زبانوں میں شعر کہے ہیں سندھی میں بھی ان کے اشعار ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے:

دادو غافل چھودتے، آہے منجھی مقام
درگاہ میں دوآن تت، پے نہ ویھٹو پان

(بے وقوف کیوں بنتے ہو؟ اس کی جائے رہائش اندر ہے، من ہی سچی درگاہ ہے اس کو وہاں دیکھو)

ان کے علاوہ شاہ عنایت، (وفات ۱۷۱۹ یا ۱۷۰۱) شاہ لطیف (۱۷۵۲ - ۱۶۸۹) وغیرہ کا کلام ملتا ہے۔

(۷) پنجابی زبان

پنجابی کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے تین ہندوستانی زبانیں" میں کہا گیا ہے کہ "مذکورہ بالا سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ دورِ حاضر کی ہند آریائی زبانیں اپ بھرنش سے ماخوذ ہیں۔ ہیم چندر اپ بھرنش کی بہت سی اقسام کا ذکر کرتا ہے اور ایک دیہاتی اپ بھرنش کا بھی نام لیتا ہے۔ علما کا خیال ہے کہ یہی دیہاتی اپ بھرنش پنجابی کا ماخذ تھی۔"

برج موہن دتا تریہ کیفیہ میں فرماتے ہیں "اول یہ خصوصیت ہے کہ شورسینی اپ بھرنش کی جتنی آمیزش پنجابی میں پائی جاتی ہے اتنی کسی ہند آریائی زبان میں نہیں ہے۔"

تین ہندوستانی زبانوں میں درج ہے "اجمالاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساتویں آٹھویں صدی میں موجودہ پنجابی کا بیج بو یا گیا۔" ۱۰۰۰ء تک پنجابی اپ بھرنش کے زیرِ سایہ پرورش پاتی رہی، ناتھ جوگیوں نے اس کو آلۂ کار بنا کر اپ بھرنش سے جدا کیا اور ۱۰۰۰ء کے بعد یہ نکھری شکل میں نمودار ہوئی۔

اپ بھرنش کے انھیں شاعروں کا نمونہ پنجابی کے ارتقا میں بھی سامنے آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ لب و لہجہ گجراتی، اڑیا، بنگالی وغیرہ سے قدرے مختلف ہے۔ نمونہ چونکہ پہلے دیا جا چکا ہے لہٰذا مزید نمونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۸) ہندی بھاشا

ہندی زبان کے تقریباً سبھی مورّخ کہتے ہیں "ہندوستان کے شمالی علاقہ اور مہاراشٹر صوبہ میں جتنی آریہ زبانوں کے متعلق بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں سے زیادہ تر بولیوں کا انحصار اپ بھرنش پر ہی ہے۔ اپ بھرنش ہی شکل بدل کر ملکی زبان کے روپ میں قائم ہے۔"

(ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس۔ اجودھیا پرشاد سنگھ۔ ص ۴۲۔)

ہندی کے مورّخین نے بھی تقریباً انھیں سدھیوں کی مثالیں دی ہیں جن کا اسمیا، اڑیا، گجراتی، بنگلہ، مراٹھی اور سندھی کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۹) اردو زبان

اب اردو کا معاملہ سامنے آتا ہے جدید ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کا سلسلہ تواپ بھرنش سے باضابطہ دکھایا جاتا ہے مگر اردو کے ارتقا کا آغاز مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے اردو پیدا ہوئی۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ سندھی میں عربی' فارسی الفاظ کا ذخیرہ اردو میں عربی فارسی کے ذخیرۂ الفاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے علاوہ ازیں سندھی کا رسم خط بھی فارسی یا عربی سے ماخوذ ہے مگر اسے کوئی ہندو مسلمان کے اختلاط کا نتیجہ قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح مسلمانوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی بستیاں آباد کیں مگر وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔ چلیے مان لیا وہاں مسلمان کم تعداد میں آئے ہوں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے' وہاں تمل پر عربوں کے گہرے اثرات ہیں یہاں تک کہ ان کے حروفِ تہجّی میں بھی مسلمانوں کے اثر سے چار حروف کا اضافہ ہوا ہے علاوہ ازیں وہاں کے مسلمان تمل بھی عربی رسم خط میں لکھتے رہے ہیں اور آج بھی بہت سے مسلمان عربی رسم خط میں تمل لکھتے ہیں۔ پروفیسر انصار اللہ نے اس موضوع پر اپنی کتاب "اردو پر تمل کے اثرات" میں اچھی روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں نے بنگالی، گجراتی، مراٹھی، سندھی، پنجابی اور دیگر تمام جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لیے کام کیا ہے ان تمام زبانوں میں مسلم صوفی شعرا نے کلام کیا ہے اور اس حقیقت سے کوئی بھی مورّخ انکار نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ان زبانوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا نتیجہ نہیں قرار دیا جاتا۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے تمام جدید ہندوستانی زبانوں میں چالیس سے ساٹھ فیصد الفاظ عربی فارسی سے ماخوذ ہیں۔ اور اتنے ہی الفاظ اردو میں بھی عربی فارسی سے آئے ہیں' اس کے باوجود اردو کو مشرف بہ اسلام کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔

دراصل اردو کا ارتقا بھی بالکل انھیں خطوط پہ ہوا ہے جن پر دیگر جدید ہندوستانی زبانوں کا ارتقا ہوا ہے جس طرح گجراتی، پنجابی اور ہندی کے مسلمان صوفی شعرا عربی رسم خط

یں قدرے ترمیم واضافہ کے ساتھ کلام کرتے رہے ہیں اور جس طرح ان زبانوں میں عربی فارسی کے الفاظ نے اپنی جگہ بنائی ہے اسی طرح اردو میں بھی ہوا ہے' فرق محض علاقے کا ہے گنگا جمنا کا وہ علاقہ جو ہند کہلاتا تھا وہاں کی اپ بھرنشوں نے ترقی کر کے جس زبان کو صورت دی اسے ہندی، ہندوی اور اردو کہا گیا۔

فرانسیسی اور ہسپانی لوگوں نے جو ہندوستان کے لیے اجنبی تھے، یہی سمجھا کہ ہندوستان میں مسلمان آباد ہیں۔ وہ مسلمانوں کو "مور" یعنی مراقش کہتے تھے لہٰذا ان کی زبان کو بھی "مورش" کہا پھر علاقے کی مناسبت سے ہندوستانی انڈیکا وغیرہ کہتے رہے۔

جب ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کر کے ملک پر قبضہ کا منصوبہ بنایا گیا تو تاریخ اور زبان کو خصوصی نشانہ بنایا گیا۔ تاریخ میں ایلیٹ نے اور زبان میں گریرسن اور فورٹ ولیم کے ایک حلقے نے حکمران انگریزوں کی شہ پر اردو زبان سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکلوا کر ایک نئی زبان تشکیل دی اور اردو کے قدیم نام ہندی کو اس نئی زبان کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے باقاعدہ اس بات کا پروپگنڈہ شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ انھوں نے اس نئی زبان کے لیے پہلے توکیتھی اور پھر ناگری رسم خط کو ترقّی دی۔ ابتدا میں تو لوگ ورغلانے میں نہیں آئے۔ انھوں نے کھلے عام اس شرارت کی مخالفت کی مگر رفتہ رفتہ انگریزوں کی مالی مدد سے متاثّر ہوکر ہندی اور اردو کا جھگڑا شروع کر دیا۔

جس طرح ایلیٹ نے مقامی باشندوں سے فارسی میں ہندوستان کی تاریخیں لکھوائیں ان میں تحریف کی اور اسی بنیاد پر جھوٹی تاریخیں مرتب کیں بالکل اسی طرح اپنے ملازموں سے اردو زبان کے بارے میں ایسی باتیں لکھوائیں جن سے بہت سے غلط تصوّرات پھیل گئے۔

ضرورت ہے کہ جس طرح سے دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کے مورّخین نے آزادانہ طور پر کام کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے ہیں اردو زبان کے مورّخ بھی ایسا کریں اور جن مورّخین نے اردو کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد سے قبل کی زبانوں اور خاص طور پر اپ بھرنش سے جوڑا ہے ان کی باتوں اور دلائل پر غور کریں۔

مآخذ

(۱) ہندوستانی زبانوں کی تاریخ (ہندی) سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ۔ دہلی
(۲) ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ شیام چندر کپور۔ گرنتھ اکاڈمی نئی دہلی
(۳) اردو پر تمل کے اثرات ۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ بیت الابصار۔ علی گڑھ
(۴) تین ہندوستانی زبانیں۔ مطبوعہ دہلی
(۵) تاریخ ادبِ اردو۔ گیان چند جین۔ ترقی اردو بیورو۔ دہلی
(۶) ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس۔ اجودھیا سنگھ اپادھیائے۔
(۷) ہندی ادب کی تاریخ۔ پروفیسر محمد حسن انجمن ترقی اردو ہند۔
(۸) بنگلہ ادب کی تاریخ۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ۔ ڈھاکا یونیورسٹی۔
(۹) اردو کا عظیم ترین المیہ (۱۸ اپریل ۱۹۰۰ کا فیصلہ) ڈاکٹر حکم چند نیر۔
مطبوعہ شیرازہ (دو ماہی) شمارہ ۴ - ۱۹۷۸
(۱۰) اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ڈاکٹر پرکاش مونس
(۱۱) ہند ایرانی اور ہندی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی۔ ترقی اردو بیورو۔ دہلی

لمعات بصیرت

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

قدیم درویش راجہ شاعر بھرتری ہری کے نیتی شتک، شرنگار شتک اور ویراگیہ شتک کا سنسکرت سے براہ راست مکمل اور منظوم ترجمہ۔ کہنہ مشق بزرگ شاعر رگھوناتھ سہائے کی دس سالہ عرق ریزی کا نچوڑ۔ ہندستان کی قدیم دانش کا شاعرانہ اظہار

قیمت : 40 روپے

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اردو کونسل، ویسٹ بلاک۔۱، ونگ۔6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔006 110

فون : 6179657, 6103938, 6103381 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

فرہنگِ آصفیہ، مولفہ: سید احمد دہلوی

یہ اردو زبان کا وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھا۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی سنسکرت اور انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان کا جز بن چکے ہیں۔ اس لغت کی کچھ اہم خصوصیات یہ ہیں۔

- عدالتی الفاظ
- بیگماتی محاورات
- اہلِ پیشہ واہلِ حرفہ کی ضروری اصطلاحات
- داخلِ روزمرہ ضرب الامثال
- اشارات وکنایات
- تاریخی واقعات
- مناسب حال مادے
- علم زبان کے رموز ونکات
- اردو صرف ونحو کے قاعدے
- ملک کی متداولہ رسمیں
- قدیم وجدید تحقیقات کے اختلافات مع نظائر
- نظم ونثر میں لفظوں کے کثیر المعانی استعمال کی مثالیں اور وجہ تسمیہ
- تمام اولیا اور فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع حالات
- علمائے کرام کے نام اور مختصر سوانحی حالات

علاوہ ازیں دیگر امور کی تشریحات بھی اس لغت میں درج ہیں۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ لغت ۵۵ ہزار سے زائد الفاظ کا بے مثال ذخیرہ ہے۔
فوٹو آفسیٹ سے شائع کردہ اس فرہنگ میں اصلی ایڈیشن کی بعض غلطیوں کا ازالہ کردیا گیا ہے۔

سائز : 20x26/4

صفحات : ڈھائی ہزار سے زائد

قیمت : (مکمل تین جلدیں) 750روپے

درج ذیل پتوں سے طلب کریں

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان

ویسٹ بلاک 1، ونگ 6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Green House, 5-4-435/20, Station Road, Nampally, Hyderabad - 500001(A.P.)

ایس۔جمال محمد

ہندوستان کے کثیر لسانی منظرنامے میں اردو

(مسائل اور امکانات کا ایک تاریخی جائزہ)

آزادی سے پہلے اردو کی صورتِ حال

ہندوستانی اور غیر ملکی اسکالروں اور ماہرینِ لسانیات نے اس بات کا مسلسل اعتراف کیا ہے کہ اردو ایک ہند۔آریائی زبان ہے جس کی جڑیں دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جانے والی مقامی بولیوں کے راستے سے شورسینی پراکرت تک پہنچتی ہیں اور اس طرح یہ ملک کے ثقافتی اور لسانی امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اس کی جڑیں ابتدائی دور سے ہی مشترکہ ہندوستانی ثقافت میں دور تک پیوست ہوتی چلی گئی ہیں۔ ملک کو آزاد کرانے میں بھی اس کا اہم رول رہا ہے۔ یہ سب ماہرِ لسانیات اس زبان کے شاندار ماضی کو تسلیم کرتے ہیں اور برصغیر میں اس کی بلند ادبی روایات کے قایل ہیں ـــــ یہ وہی زبان ہے جسے کبھی ریختہ کا نام دیا گیا، کبھی ہندوی کا اور بعد میں ہندوستانی یا اردو کا۔ برصغیر ہند میں اس کی عظیم ادبی روایات اور اعلا مقام کے پیشِ نظر گیرین نے اپنی کتاب "ہندوستان کا لسانی سروے، جلد ۹، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۴ تا ۵۶) میں اردو کے بارے میں لکھا کہ یہ پورے ملک میں بولی جاتی ہے اور کم و بیش یہ اپنی اصلی شکل میں مروج ہے، نیز یہ کہ یہ عدالتوں کی بھی زبان ہے اور اسی زبان کے ذریعے عوام الناس کے مختلف طبقے باہمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ آکسفورڈ کی لغت میں بھی مذکور ہے کہ ہندوستانی ہندوستان کی رابطے کی زبان ہے۔

اردو زبان کے ارتقا پر نظر ڈالنے اور ماضی میں اس کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان دلّی سلطنت کے عہد میں گیارھویں صدی عیسوی

میں نمودار ہوئی۔ اس عرصے میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک ملا جلا ضابطہ معرض وجود میں آیا جس میں فارسی، عربی، ترکی سے لیے گئے الفاظ کے ساتھ ساتھ برج بھاشا، پنجابی، کھڑی بولی اور دیگر بولیوں کے الفاظ کا بھی احاطہ کیا گیا۔ یہ زبانیں دو آب میں بولی جاتی تھیں اور انھیں کے ذریعے مقامی آبادی اور غیر ملکی باشندوں کے درمیان مفید رابطے قائم ہو رہے تھے۔ یہ مخلوط ضابطۂ الفاظ پہلے پہل پنجاب کی سرزمین پر رائج ہوا اور پھر گیارھویں صدی عیسوی کے آخری دہے کے آس پاس دلّی منتقل ہوا۔ درحقیقت اس زبان کا استعمال بنیادی طور پر صوفیائے کرام نے مختلف طبقات کے درمیان جذباتی ہم آہنگی لانے کے لیے کیا۔ گیارھویں تا تیرھویں صدی عیسوی کے دوران داتا گنج بخش ہجویری (۱۰۶۳ء) خواجہ معین الدین چشتی (۱۱۴۲ء تا ۱۲۳۵ء)، بختیار کاکی (۱۲۳۶ء-۱۱۸۶ء) بابا فرید شکر گنج (۱۲۶۵ء-۱۱۸۰ء) حضرت خواجہ نظام الدین اور حضرت امیر خسرو (۱۳۲۵ء-۱۲۵۵ء) کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس زبان کے ذریعے رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔ حضرت امیر خسرو کو اردو زبان کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

بعد میں اردو زبان شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان کی طرف گئی۔ دکن میں یہ زبان ۱۳۰۷ء میں علاء الدین خلجی کے ساتھ منتقل ہوئی۔ یہ عمل جاری رہا اور بعد میں ۱۳۲۶ء میں محمد بن تغلق نے اپنا دارالسلطنت دلّی سے بدل کر دولت آباد میں قائم کیا اور کچھ عرصہ بعد دولت آباد سے واپس دلّی لوٹ آیا، لیکن شمالی عوام کا ایک بڑا حصہ وہیں مقیم ہو گیا۔ اس عمل سے اردو زبان جنوب میں عوامی مقبولیت حاصل کر سکی۔ سولھویں صدی عیسوی میں ابراہیم عادل شاہ نے پہلی بار اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ جنوب میں بہمنی بادشاہوں کے دور میں (۱۵۲۹ء-۱۳۴۷ء) اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ خود مختار حکومتیں: عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی اقتدار میں آئیں۔ ان سلطنتوں نے بھی اس زبان کی پرورش اور آبیاری کی۔ دکن نے شمالی ہند کے مقابلے میں بہت پہلے اس زبان کو اظہارِ ادب کا وسیلہ بنایا۔ جبکہ شمالی ہندوستان میں فارسی زبان سرکاری زبان کے طور پر دورِ مغلیہ کے آخری مرحلے تک استعمال کی جاتی رہی۔ جنوبی ہندوستان میں اردو نے نظامی، نصرتی، وجہی، محمد قلی قطب شاہ غواصی، ابن نشاطی، ولی اور سراج

جیسے بہت سے باکمال اور نامی گرامی شعرا پیدا کیے۔ البتہ اردو شاعری نے ولی (۱۶۸۸ء - ۱۷۴۴ء) کے شمالی ہند اور خاص کر ۱۷۰۳ء میں سلطنت مغلیہ کے دارالسلطنت دہلی کے دورے کے بعد سے ہی تیز رفتار اختیار کی۔ ان شعرا کی وجہ سے غزل، مثنوی، نظم، قصیدہ وغیرہ کی شکل میں ادبی سرمایہ فراہم ہوتا رہا۔ اب تو محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جنوب میں اردو زبان نہ صرف رابطے کی زبان تھی بلکہ انتظامی امور میں سرکاری زبان بھی تھی۔

یہ کوئی واحد حیران کن بات نہ تھی کہ صرف دکن کے شاعروں نے اردو اور اس کی شاعری کو فروغ دیا اور اس عمل میں اس دَور کی سلطنتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا بلکہ شمالی ہندوستان میں بھی بطور شاعری کی زبان سولھویں صدی کے اواخر سے نظر آنے لگتی ہے جب چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء - ۱۶۶۲ء) نے اردو میں شاعری کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت امیر خسرو کے بعد غالباً وہ شمالی ہند کے پہلے اردو شاعر تصوّر کیے جاتے ہیں۔ البتہ اردو شاعری نے ولی (۱۶۸۸ء - ۱۷۴۴ء) کے شمالی ہند اور خاص کر ۱۷۰۲ء میں سلطنت مغلیہ کے دارالسلطنت دہلی آمد کے بعد سے تیزی سے ترقی کی۔ دکنی اردو میں اُن کی شاعری نے شمالی ہندوستان کے شاعروں کو اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے ادبی اظہار کے لیے فارسی سے اردو کی طرف رخ کر لیا۔

دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ شمالی ہند میں دَورِ مغلیہ میں اردو کو کبھی بھی سرکاری درجہ حاصل نہ ہوا۔ اس کا مرتبہ رابطے کی زبان کے طور پر رہا۔ عوام میں اس کی مقبولیت کے باعث اور خواص کی اس زبان پر توّجہ کی وجہ سے اس دَور کے فارسی میں شاعری کرنے والے بھی اردو میں شعر کہنا پسند کرنے لگے۔ بعد کے زمانے میں صورتِ حال اس قدر بدلی کہ اردو میں ادب نوازوں اور شاعروں کی بڑی تعداد کا ظہور ہوا اور مظہرِ جانِ جاناں، خان آرزو، میرؔ، میر درد، سوداؔ، آتشؔ، ناسخؔ، انیسؔ، دبیرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، انشاؔ، ظفرؔ، امیر مینائی، حالیؔ، آزادؔ، اقبالؔ، اصغرؔ، جگرؔ، چکبستؔ، ترلوک چند، حسرتؔ موہانی، جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ، مجازؔ، دانشؔ اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں نے اردو ادب کو وہ جلا بخشی کہ اس کی تاب آج تک برقرار ہے۔

خشونت سنگھ (۱۹۸۲ء) نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ برصغیر کی کوئی دوسری زبان اس قدر شاندار ادب پیش کرنے سے قاصر رہی ہے جس قدر کہ اردو نے پیش کیا ہے اور وہ بھی اس قدر مختصر سے عرصے میں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز تک اردو نثر کے نمونے چند ایک ہی تھے۔ مثلاً یہ کہ "معراج العاشقین" اور ملا وجہی کی "سب رس" یا دو ایک اور۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ خط و کتابت فارسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ کتابوں کے پیش لفظ، اختتامیہ، ابتدائی کلمات، تاریخ اور تذکرے سب کے سب فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ سودا (۱۷۱۳ - ۸۶) پہلے اردو شاعر تھے جنھوں نے اپنے ادبی مجموعے کا پیش لفظ اردو نثر میں لکھا۔ بعد میں غالب (۱۷۹۵ء - ۱۸۶۹ء) اور ان کے ہم عصروں نے خطوط نویسی کے فن سے اردو نثر کی ترویج میں اضافہ کیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک اور انیسویں صدی کے پہلے تیس برسوں میں اردو نثر کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ اس عرصے میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کے فروغ میں زبردست خدمات انجام دیں۔ اس ادارے نے فارسی متن کو اردو میں منتقل کروایا اور کچھ طبع زاد کتابیں بھی لکھوائیں۔ ۱۸۲۰ء تک اردو نہ صرف مواصلات کا ایک اہم وسیلہ قرار پائی بلکہ اسے انتظامی امور میں بھی دخل حاصل ہو گیا۔ ۱۸۳۰ء میں اردو کو عدالتی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور بہار، اتر پردیش، پنجاب، ہریانہ، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں اسے عدالتوں اور انتظامیہ میں استعمال کیا جانے لگا۔

اردو نثر کے فروغ میں ادبی مواد کے اظہار کے وسیلے کے طور پر، عدالتی زبان اور انتظامی امور کی زبان کی حیثیت سے نیز سائنسی مواد کے اظہار میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) اور ان کے ہم عصروں نے علی گڑھ تحریک کے توسط سے بہت کچھ دیا۔ سرسید کی سائنٹی فک سوسائٹی، دلی کالج، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے دارالترجمہ اور کچھ دیگر اداروں نے ترجموں اور طبع زاد مواد کی شکل میں سائنسی ادب فراہم کیا جس کو بڑے پیمانے پر مقبولیت ملی۔ ۱۸۳۷ء میں آخر کار فارسی کو عدالتوں سے ہٹا دیا گیا۔ برطانوی ہندوستانی فوج میں رومن رسم الخط میں لکھی گئی اردو رائج کی گئی، فوج کے

محکمے نے رومن اردو میں کتابیں شائع کیں تاکہ سپاہی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ خبروں کو بھی عربی اور فارسی آمیز زبانِ اردو میں نشر کیا گیا۔ اس طرح اردو کو مکمل حمایت حاصل ہوئی لیکن ۱۸۳۵ء میں میکالے نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے ایسے ہندوستانی پیدا ہوں جو نسل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن ذہنی افکار اور مزاج کے اعتبار سے برطانوی ہوں۔ اس اعلان اور کوشش نے اردو پر بڑا اثر ڈالا کیونکہ اس سے انگریزی کو زبردست حمایت حاصل ہوئی اور تعلیم میں اس کا وزن زیادہ ہوگیا۔ یہ محض میکالے ہی نہ تھا جس نے اردو کے وقار کو ٹھیس پہونچائی بلکہ ایسی بہت سی ہندو احیا پرست تنظیمیں بھی تھیں جو یہ نہیں چاہتی تھیں کہ اردو یا ہندوستانی کو فارسی، عربی رسم الخط میں لکھ کر اسے ہندوستان کی سرزمین پر فروغ دیا جائے۔

میکالے کی ان حقارت آمیز کوششوں کے باوجود جن کے تحت اردو کو ہندوستان کے نظامِ سیاست میں دبانے کے اقدامات کیے گئے، صدر دیوانِ عدالت نے جو اس دور میں ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت تھی، ۱۸۳۸ء میں یہ حکم دیا کہ ہندوستانی زبان کو عربی فارسی رسم الخط میں تمام ماتحت عدالتوں میں استعمال کیا جائے۔ اس پالیسی کے ردِّعمل کے طور پر بہت سی یادداشتیں سرکارِ برطانیہ کو بھیجی گئیں جن میں درخواست کی گئی کہ ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں فارسی آمیز اردو کی جگہ کام میں لایا جائے۔ یہ درخواست کرنے والے ہندی کے حامی یا ہندو احیا پرست تھے۔ لیکن برطانوی سرکارِ ہند نے اس مطالبہ پر عمل پیرا ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانوی حکومت کے انکار کے ردِّعمل کے طور پر ناگری پرچارنی سبھا نے آریہ سماج کی حمایت سے ایک وفد سر ولیم مور سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ سر ولیم مور اس زمانے میں شمال مغربی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ اس وفد نے یہ درخواست کی کہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو تسلیم کیا جائے تاکہ اسے عدالتوں اور انتظامی امور میں استعمال کیا جا سکے۔ لیکن گورنر نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس تجویز کے مسترد ہو جانے کے ردِّعمل میں ہندو بنیاد پرستوں کی قیادت میں اردو کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی اور ۱۸۸۰ء میں برطانوی سرکار کو مجبور کر دیا گیا کہ ہندی کو ناگری رسم خط میں اردو کے ساتھ ساتھ قائم کیا جائے۔

اس سے اردو کے کاز کو نقصان پہنچا اور مسلمانوں کو بھی جو کہ اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر رہے تھے۔ درحقیقت یہ تبدیلی مسلمانوں کی ان روایات سے بدلے کے روپ میں متوقع تھی جو صدیوں سے ہندوستان میں چلی آرہی تھیں۔ ہندی کی ہم وجودیت کا یہ مطالبہ ہندو بنیاد پرستوں نے ایک ایسی قوت کے روپ میں پیش کیا جس سے وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے کثیر لسانی منظر نامے سے اردو کو اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے اور اسی وقت سے ہر ہندو نے اپنی بولی کو ہندی کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اردو بول رہا ہے یا علاقائی زبان یا مقامی بولی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خاں نے وفات پائی اور اردو کاز کی حمایت میں علی گڑھ تحریک کمزور پڑ گئی۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے کل ہند پیمانے پر فرقہ وارانہ تناؤ بڑھنے لگا اور ہندوستانی قوم پروری کی جگہ ہندو احیا پرستی نے لے لی۔ ۱۹۰۵ء میں ہندو مہاسبھا اور انڈین مسلم لیگ دونوں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کو جداگانہ حق رائے دہندگی حاصل ہوا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیچیدہ تنازعہ پیدا کیا۔ اس صورتِ حال سے ہندی اور اردو کے درمیان روز بروز دوری بڑھتی چلی گئی۔

چونکہ بڑے مذہبی گروہ / برادریاں ہندوستان میں لسانی اعتبار سے یکساں نہیں تھیں اور یہ صورت حال ابھی تک ہے، لہٰذا نہ تو مسلمان اور نہ ہی ہندو سیاسی اعتبار سے کسی ایک زبان پر اپنے پیروکاروں کو متفق کر سکے چنانچہ علاقائی زبان کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں یہی صورتِ حال دیکھنے کو ملی۔ علاقائی زبانوں کے استعمال کی آواز اٹھانے والی تحریکات کے ابھرنے سے، قومی رہنماؤں نے یہی مناسب خیال کیا کہ قومی تحریک کو متحدہ رکھنے کے لیے کوئی مشترک زبان ہونی چاہیے۔

۱۹۰۳ء میں اردو کے حامیوں نے انجمن ترقیِ اردو کی بنیاد ڈالی اور اس انجمن نے اردو کو مشترک زبان کے طور پر پیش کرنے کے لیے کافی کوششیں کیں اسی طرح ناگری پرچارنی سبھا نے بھی ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنیاد ڈالی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اس کے صدر بنے۔ اردو کے ایک زبردست مخالف پرشوتم داس ٹنڈن

بھی ان کے ساتھ ہو لیے اور ملک میں ہندی کو مشترک زبان کے طور پر پیش کرنے کے لیے تحریک شروع کر دی گئی۔

گاندھی جی ہندوستان میں ایک مشترک زبان کے زبردست حامیوں میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک مشترک زبان کے سہارے قومی تحریک کو مل جل کر آگے بڑھایا جائے۔ اس نظریے کے تحت انھوں نے ہندوستانی زبان کی وکالت کی اور اسے ایک ایسی قومی زبان کے طور پر پیش کیا جسے ناگری میں بھی اور فارسی عربی رسم الخط میں بھی لکھا جا سکے۔ اس فارمولے کے ذریعے وہ سماجی و ثقافتی اور سیاسی توازن قائم کرنا چاہتے تھے لیکن بال گنگا دھر تلک نے ۱۹۱۵ء میں ناگری پرچارنی سبھا کی کانفرنس میں پُر زور طریقے پر یہ دلیل دی کہ صرف ہندی کو ہی دیوناگری رسم الخط میں قومی زبان کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ ان کا اس بات پر اصرار تھا کہ اس طرح کی زبان ہی سب سے زیادہ مضبوط ثابت ہوگی اور جو قوم کو یکجہتی کے دھاگے میں بھی باندھ کر رکھ سکے گی۔

۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین مسلم لیگ کے خوشگوار تعلقات تھے اس کی وجہ سے اردو کی ترقی کے لیے موافق فضا تھی۔ ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلمائے ہند قائم ہوئی جس نے بعد میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ قائم کی جامعہ ملّیہ نے بھی اردو کے فروغ کے لیے بہت خوشگوار ماحول تیار کیا۔

۱۹۲۵ء کا سال ایک لحاظ سے بہت اہم سال تھا۔ اسی سال گاندھی جی نے کانگریس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندوستانی کو کارروائی چلانے کے لیے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لے۔ چنانچہ کانپور کے اجلاس میں کانگریس نے ایک قرارداد پاس کی کہ اجلاس کی کارروائی ہندوستانی میں چلائی جائے اور ہندوستانی کے ساتھ ساتھ صوبائی زبان کا بھی استعمال ہو۔ ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی گاندھی جی کے مشورے کا اعادہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ ہندوستانی کو سرکاری طور پر کل ہند زبان تسلیم کر لیا جائے۔ انھوں نے سوچا کہ ہندوستان کی سرکاری زبان بنیادی ہندوستانی کی کوئی شکل ہو سکتی ہے جو ریاست کی تھوڑی سی کوشش سے پورے ملک میں

تیزی سے پھیل سکتی ہے اور اس کے ذریعے وہ قومی اتحاد قائم ہو سکتا ہے جس کے ہم سب متمنی ہیں۔

برطانوی حکمرانی کے تحت ہند سرکار نے ۱۹۳۵ء میں سیلف گورنمنٹ کے سلسلے کو توسیع دی۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات ہوئے جس میں انڈین نیشنل کانگریس کو قابلِ ذکر کامیابی ملی۔ اس پیش رفت کے سبب کانگریسی رہنماؤں مثلاً مدن موہن مالویہ اور شردھانند نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات شروع کیں اور اس طرح اردو کے معاملے پر فرقہ واریت کے حامی احیا پرست افراد نے جارحانہ رخ اختیار کیا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین مسلم لیگ کے درمیان زبردست دوری پیدا ہوگئی۔ ساہتیہ سمیلن کا ۱۹۴۱ء میں ابوہر میں اجلاس ہوا جہاں کہ احیا پرستوں کے گروپ نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی قیادت میں کھل کر یہ عہد کیا کہ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں اور انھوں نے ہندی کے تصوراتی خاکہ میں اردو کو جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ احیا پرست جو شروع میں اردو کی الگ شناخت کی مذمت کرتے رہے اب انھوں نے ہی اردو کو ایک الگ زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کے بعد سے یہ نظریہ کبھی قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے ابوہر کے اجلاس کے اس اعلان پر اپنی ناخوشی ظاہر کرتے ہوئے سمیلن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا لیکن اس کی رکنیت نہیں چھوڑی۔ وہ ۱۹۴۵ء تک اس کے ممبر رہے مگر آخر میں جب انھوں نے دیکھا کہ احیا پرستوں کے ٹولے میں کوئی مربوط انداز نظر نہیں ہے تو انھوں نے رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ قومی زبان کے مسئلے پر اس ایجی ٹیشن اور غیر یقینی صورتِ حال نے بالآخر ۱۹۴۷ء میں ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ تقسیم ملک کے کچھ اور ہی سیاسی اسباب تھے اور زبان کا کوئی مسئلہ اس کے لیے ذمہ دار نہ تھا۔

حصولِ آزادی کے بعد اردو کی صورتِ حال:

ملک کو آزادی مل گئی اور ملک تقسیم بھی ہو گیا مگر ہندی، اردو اور ہندوستانی کا مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ ہندو مہاسبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن کو ہندی زبان کے لیے واضح

اکثریت کے بارے میں شبہات تھے۔ اس لیے ۱۹۴۹ء میں آئین ساز اسمبلی میں جو بحث ہوئی اس میں اس مسئلے کے حل کے لیے دونوں زبانوں کے لیے ووٹ ڈالنے کا مشورہ دیا گیا۔ ہندی کے حق میں ۷۸ ووٹ پڑے اور ہندوستانی کے حق میں ۷۷۔ اس طرح ہندی زبان صرف ایک ووٹ سے کامیاب رہی۔ اس سے ہندی اور ہندوستانی کی قوت کا اظہار ہوا۔ مسلمانوں کی آبادی صرف ۳ کروڑ بیس لاکھ تھی جبکہ غیر مسلموں کی آبادی ۳۱ کروڑ تھی۔ اس طرح یہ قومی رہنماؤں مثلاً گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجیندر پرساد کی احیا پرست قوتوں کے ہاتھوں شکست تھی جنھوں نے ان قومی رہنماؤں کی مربوط پالیسی اور اندازِ نظر کو مسترد کر دیا تھا۔

البتہ اسی سال آئین کے آرٹیکل ۲۹، ۳۰ اور ۳۵۰ کو اقلیتوں کے حقوق سے جوڑ دیا گیا تاکہ وہ اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کی امتیازی خوبیوں کا تحفظ کر کے ان کے ذریعے اپنی شناخت برقرار رکھ سکیں۔ ان کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے چلانے کا حق دیا گیا۔ ان کو یہ حق بھی حاصل رہا کہ وہ ریاست یا مرکز میں اپنی شکایات کے ازالے کے لیے اپنی درخواست یا تو ریاست میں رائج زبان میں یا مرکز میں استعمال ہونے والی زبان میں لکھ سکیں۔ اُن کو اپنے بچّوں کو پرائمری تعلیم مادری زبان میں دلانے کی وافر سہولتوں کا بھی یقین دلایا گیا۔ ہندی احیا پرست اس صورتِ حال سے ناخوش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سبھی کام ہندی میں ہوں اور ہندی ہی قومی سرکاری زبان ہو۔

۱۹۵۱ء میں اُتّر پردیش کا سرکاری زبان کا قانون بنا۔ اس میں دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو باضابطہ بنانے کی بات کہی گئی۔ اس میں اردو بولنے والوں کے لیے بھی تمام واجب سہولتوں کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک بہت پیچیدہ بات تھی کیونکہ اردو کے حامیوں نے اس کے ذریعے اپنی جنگ میں شکست کھائی تھی اور اردو زبان ریاست اُتّر پردیش میں بے گھر ہو گئی تھی۔ اردو کو دوسری ریاستوں میں بھی دوسری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان ریاستوں میں آبادی کا کافی بڑا حصّہ اسے بولتا اور استعمال کرتا تھا۔ اردو کے لیے یہ ایک کافی نازک صورتِ حال تھی اور اردو بولنے والوں کے لیے بھی یہ صورتِ حال انتہائی مشتبہ تھی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں پارلیمنٹ میں سوالات کیے گئے۔ لوگوں نے اردو کے بارے میں ہندوستان

کے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی سوالات کیے۔

اردو کے حامیوں نے اگرچہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا تھا، تاہم انھوں نے ملک میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ اردو کے تئیں غیر موافق صورتِ حال کے ردِّ عمل کے طور پر انجمن ترقیِ اردو نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے توسط سے ۲۵ لاکھ لوگوں کے دستخطوں سے ایک مطالبہ صدر جمہوریۂ ہند کو پیش کیا۔ اس میں دس لاکھ دستخط تو صرف لکھنؤ والوں کے ہی تھے۔ اس درخواست میں اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کا مطالبہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بھی مانگ کی گئی تھی کہ پرائمری درجات کی تعلیم اردو کے ذریعے ہو، اردو میڈیم اسکول قائم کیے جائیں، اردو استادوں کی بڑی تعداد تیار کی جائے اور اردو کی درسی کتب تیار کی جائیں نیز ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔

۱۹۵۵ء میں ریاستوں کے تنظیمِ نو کمیشن نے جو لسانی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا، ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جس میں اردو کے لیے کوئی گنجائش ہو۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقیِ اردو نے اردو کے حامیوں پر مشتمل ایک وفد بھیجا۔ اس کے ارکان درج ذیل تھے۔

مسز ارونا آصف علی، جناب گوپی ناتھ امن، مولانا حفظ الرحمٰن، سردار حکم سنگھ، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ایچ۔ این۔ کنزرو، ڈاکٹر تارا چند، جناب حیات اللہ انصاری، جناب پی۔ این۔ سپرو، پنڈت سندر لال، محترمہ اوما نہرو، جناب ترلوک سنگھ، پروفیسر ایم حسن رضوی وغیرہ۔

اس وفد نے انھیں مطالبات کو دہرایا جو وہ ۱۹۵۴ء میں پیش کر چکے تھے۔ انھوں نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندی بولی جانے والی ریاستوں اور آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

مئی ۱۹۵۸ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے بریلی میں کُل ہند اردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حکومت سے کہا کہ اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔ ۱۹۵۸ء میں پراگ جوتسپور میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں یہ بات کہی گئی کہ آئین

کے آٹھویں شیڈول میں مذکورہ تمام زبانوں کو یکساں طور پر آگے بڑھایا جائے۔
اسی مہینے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے درج ذیل قرارداد پاس کی گئی :

آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں متذکرہ قومی زبانوں میں سے ایک زبان یعنی اردو کے بارے میں خاص طور پر شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ حالانکہ اردو بہت سے لوگوں کی مادری زبان ہے اور اس کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوتا ہے لیکن یہ کسی بھی ریاست میں اکثریتی زبان نہیں ہے۔ البتہ ریاست جموں وکشمیر میں یہ ریاستی زبان ہے۔ جبکہ آندھرا پردیش کے چند حصّوں میں یہ علاقائی زبان ہے۔ اردو زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور سینکڑوں برسوں کے دوران ہندوستان، خاص کر شمالی ہندوستان میں پروان چڑھتی رہی۔ اسے دلّی، یو۔پی، بہار، پنجاب اور ملک کے چند دیگر حصّوں میں بخوبی بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں بڑی تعداد میں اخبارات، رسائل اور جرائد شائع ہوتے ہیں اور نئی کتابوں کی تعداد جس طرح منظرِ عام پر آرہی ہے، اس سے اس کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کمیٹی کی رائے اس لیے یہ ہے کہ دیگر قومی زبانوں کی طرح سے ہی مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو اس زبان کی تعلیم کے لیے وافر سہولتیں مہیّا کرنی چاہئیں اور علاقائی زبان کے طور پر اس کے استعمال کے لیے ضروری سہولتیں دی جانی چاہئیں خاص کر ان علاقوں میں جہاں یہ کثرت سے بولی جاتی ہے۔

اس کمیٹی نے ملک میں اردو کے مقام کو اوپر اُٹھانے کے لیے چھ مشورے پیش کیے۔ حکومتِ ہند نے اس قرارداد کو تسلیم کیا اور ریاستی سرکاروں سے کہا کہ وہ پہلے پانچ تحفظات پر عمل درآمد کرائیں۔

۱۔ پرائمری سطح کی تعلیم اور اس سطح پر لیے جانے والے امتحانات کے لیے اردو کی سہولتیں مہیّا کی جائیں۔

۲۔ استادوں کی تربیت کا بندوبست ہو اور درسی کتب کی فراہمی کا انتظام ہو۔

۳۔ ثانوی سطح کی تعلیم اردو میڈیم کے ذریعے دینے کی سہولتیں دی جائیں۔

۴۔ عدالتوں اور دفاتر میں اردو کی درخواستیں لی جائیں۔ اس کے ساتھ ترجمہ لگانے کی پابندی نہ ہو۔

۵۔ تمام قوانین، قواعد و ضوابط اور نوٹی فیکیشن اردو میں بھی جاری کیے جائیں، خاص کر اس خطّے میں جہاں کہ اردو بولنے والے علاقے کے طور پر اس کی صراحت کر دی گئی ہو۔

۱۹۶۳ء میں سرکاری زبان کا بل پیش ہوا جس میں سرکاری زبان سے متعلق کمیشن کی سفارشات کا جائزہ لیا گیا تاکہ ۲۵ر جنوری ۱۹۶۵ء تک ہندی میں سب کام منتقل کر دینے کی ہدایات کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ بعد میں یہ بل سرکاری زبان کے قانون مجریہ ۱۹۶۳ء کی شکل میں شامل کر لیا گیا۔ اس قانون میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندی زبان کو جنوبی ہند کی ریاستوں پر نہیں تھوپا جائے گا۔ اردو کے حامیوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندی زبان ایک رابطے کی زبان بن گئی ہے اور ۱۹۶۵ء تک اسے مکمل طور پر مستحکم پوزیشن حاصل نہیں ہوئی ہے تو وہ آگے آئے اور انھوں نے تمام ہندی بولی جانے والی ریاستوں میں اردو کو ایک علاقائی زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے کا مطالبہ پیش کیا۔ ایک سو چار ارکانِ پارلی منٹ نے اس وقت کے وزیرِ اعظم جناب لال بہادر شاستری سے یہ مطالبہ کیا کہ اردو کو اُن ریاستوں میں جہاں آرٹیکل ۳۴۷ کو عملی جامہ پہنانا تھا، دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک مطالبہ یہ تھا کہ ریاست گجرات، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال، مدراس (موجودہ تمل ناڈو) اور میسور (موجودہ کرناٹک) میں اردو میں مادری زبان کی حیثیت سے تعلیم دینے کی مکمل سہولتیں دی جائیں جہاں کی لسانی اقلیتیں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے قبول کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔

انھوں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرساد کے یہاں بھی درخواست دی کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلایا جائے۔ اس درخواست پر دستخط کرنے والوں میں مسٹر سیّد محمود، بیگم انیس قدوائی، مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز رینو چکرورتی، مسٹر بی این بسپر فر گیانی گورمکھ سنگھ مسافر، مسٹر انصار ہروانی، مسٹر راجیشور پرساد، مسٹر ہری داد جی، مسٹر ارجن ارورہ، مسٹر رگھوبیر سنگھ، مسٹر لوک ناتھ مشر، مسٹر رام سیوک یادو اور مسٹر این۔ سی چٹرجی شامل تھے۔

ان تمام کوششوں کے باوجود انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر آج تک

اردو کو کسی بھی ریاست میں علاقائی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا کیونکہ سرکاری زبان کے کمیشن کے قانون کے تحت کہیں بھی اردو بولنے والوں کی تعداد ریاست کی کل آبادی کے ۳۰ فی صد کے بقدر نہیں ہے۔ مزید برآں ایسا کرنے سے اس لیے بھی گریز کیا گیا کہ اس وقت کے دو مرکزی وزیروں شری سمپورنا نند اور کملا پتی ترپاٹھی نے، جو کہ وزیر تعلیم تھے، یہ اعلان کر دیا کہ اردو کو ہندی کے ساتھ کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا۔ یہی نہیں اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر پکارا گیا جو بدقسمتی سے ایک نہایت تکلیف دہ پہلو تھا کیونکہ اردو زبان کے بولنے والے اور اس کی حمایت کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ، پارسی، عیسائی اور ہندو بھی شامل تھے اور آج بھی ہیں۔ بہت سے ہندو شاعروں اور ماہرین میں برج نرائن چکبست، چندربھان برہمن (اردو کے پہلے شاعر کی حیثیت سے ابھی تک ان کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے) تلوک چند محروم، پنڈت دتاتریہ کیفی، آنند نرائن ملاّ، فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شادؔ، کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی، بلویر راج اور بہت سے دوسرے نام شامل ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے۔

ہندی کے حامیوں کے سخت روّیے سے پنڈت نہرو بھی ناخوش تھے، انھوں نے اردو کے بارے میں کہا تھا کہ:

"میں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہندی کے پرجوش حامیوں کی ان کوششوں پر مجھے گہرا دکھ ہے کہ وہ اردو کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے پاس عظیم سرمایہ ہے جس کی حوصلہ افزائی اور ہمّت افزائی ضروری ہے، لہٰذا اس زبان کی پرورش کرنی چاہیے۔"

یہ خیالات محض پنڈت نہرو کے ہی نہ تھے بلکہ اس دَور کے دیگر بہت سے عظیم رہنماؤں کے بھی تھے۔ آج بھی اردو کے ایسے بہت سے شیدائی ہیں جن کی زبان اردو نہیں ہے۔ گذشتہ سرکاروں کی ان تمام کوششوں کے باوجود اور موجودہ سرکار کی کوشش کے باوجود اردو صرف ریاست جموں و کشمیر میں ریاستی زبان ہے۔

البتّہ ہمیں اس طرح کی بحث میں بہت گہرائی تک جانے کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے بارے میں سوچ کے نئے دھارے نکالیں جس

سے کہ اردو کی پوزیشن زیادہ مستحکم ہو سکے اور جس سے کہ یہ زبان ملک کے وسیع تر گوشوں میں مقبول ہو سکے اور جس سے کہ یہ زبان علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کی جا سکے۔

اس ضمن میں ۱۹۷۰ء کے دہے کے بعد اردو کی پوزیشن بالکل بدل گئی ہے۔ اردو کے بارے میں فراست آمیز نظریات کو نئے منظر نامے میں موزوں کہا جا رہا ہے۔ اردو کے سلسلے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور اردو کو نئے تناظر میں جمانے کی کوشش ایک اچھا قدم سمجھا گیا ہے۔ فروغ اردو کی قومی کونسل کا قیام جو سابق میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے پکاری جاتی تھی، اس سلسلے میں ایک مستحکم سرکاری اقدام ہے۔ یہ کونسل ملک میں فروغِ اردو کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر سنبھالا ہے اور اردو کے کاز کے لیے کام کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ یہ یونیورسٹیوں سے روابط بڑھا رہی ہے اور زبان کو مالا مال کرنے کے لیے اسکالروں، ایجنسیوں سے رابطہ بنائے ہوئے ہے۔

فروغِ اردو کی قومی کونسل کے علاوہ کچھ ریاستوں مثلاً آندھرا پردیش، کرناٹک، بہار، اُتّر پردیش، ہریانہ، راجستھان، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر نے اردو اکادمیاں قائم کی ہیں، یہ اکادمیاں اردو زبان کے فروغ کے لیے بہترین کوششیں کر رہی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، بنگلور یونیورسٹی، میسور یونیورسٹی، گلبرگہ یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، پٹنہ اور دیگر بہت سی یونیورسٹیاں اس زبان کو مالا مال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند نے میسور میں ہندی، سنسکرت اور انگریزی کو چھوڑ کر دیگر ہندوستانی زبانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ اپنے علاقائی مراکز واقع پٹیالہ میں غیر ہندی بولی والی ریاستوں کے ملازم غیر اردو اسکولی اساتذہ کو اردو میں تربیت دیتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں نئی تشکیل شدہ ریاست ہماچل پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جانے

لگا لیکن اس کا نمبر ہندی اور انگریزی میں تعلیم کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ اس وقت کے ہماچل پردیش کے وزیر اعلاڈاکٹر وائی۔ ایس۔ پرمار کی خصوصی درخواست پر سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز واقع میسور نے حکومتِ ہند کی ہدایت پر ہماچل پردیش میں سولن کے مقام پر اردو کے لیے ایک خصوصی مرکز قائم کیا۔ ۱۹۸۵ء میں اس انسٹی ٹیوٹ نے لکھنؤ میں اردو کے لیے ایک اور مرکز قائم کیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ہندی، سنسکرت اور انگریزی کو چھوڑ کر ملک کی باقی ۱۳ ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دینے والے برسرروزگار استادوں کو تربیت دیتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس ادارہ نے ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۶ء تک علاقائی زبانوں کے مراکز کے توسط سے تیرہ زبانوں میں کل ۱۳۹۰۷ اساتذہ کو تربیت دی۔ ان میں سے پٹیالہ میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۶ء تک ۵۶۲ اساتذہ کو سولن میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۶ء تک ۷۲۹ اساتذہ کو اور لکھنؤ میں ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۶ء تک ۲۸۵ اساتذہ کو اردو زبان میں تربیت دی گئی۔ اس طرح کل ۱۳۹۰۷ میں سے ۱۵۷۶ اساتذہ صرف اردو کے ہی ہیں گویا کہ وہ سرِفہرست ہیں۔ اس ادارے نے جتنے اساتذہ کو تربیت دی، ان میں سے چوتھائی تعداد اردو کے اساتذہ کی رہی ہے۔ اس سے اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دیگر زبانوں کے مقابلے میں اس کی عوامی مقبولیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حال ہی میں حکومتِ ہند نے اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک اور قدم اُٹھایا ہے اور اس نے حیدرآباد میں اردو کی تعلیم کے لیے مولانا آزاد یونیورسٹی قائم کی ہے۔ لیکن ہندوستان کے کثیر لسانی منظر نامے میں یہی کچھ کافی نہیں ہے۔ یہ سب کوششیں زبان کے فروغ کے لیے ہو سکتی ہیں۔ مگر شمالی ہندوستان میں اردو کے تحفظ کی ضامن نہیں ہو سکتیں جہاں اردو کو روزگار سے نہیں جوڑا گیا ہے۔ شمالی ہند میں جن ریاستوں میں ہندی بولی جاتی ہے، وہ اردو بولنے والوں کے لیے روزگار کا کوئی موقع فراہم نہیں کرتیں، اس لیے اردو بولنے والے اردو کے مقابلے ہندی سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس صورتِ حال نے ریاستی سرکاروں کو اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ اردو کو سرکاری مرتبہ نہ دیا جائے۔ مزید برآں سرکاری لینگویج کمیشن کی سفارشات کے مطابق علاقائی زبان کا مرتبہ ملنے کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ ریاست کی آبادی کا کم سے کم

۳۰ فی صد اردو بولنے والا ہو، چنانچہ اس پابندی نے بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بننے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی۔

اردو کے حامیوں کی کوششوں کے سبب شمالی ہند کی ریاستوں میں اترپردیش کی ریاست میں اردو کی تعلیم کے سلسلے میں کچھ سہولتیں فراہم کی گئی ہیں، ریاستی حکومت نے کچھ دن پہلے پانچ ہزار اردو اساتذہ کے تقرر کا اعلان کیا تھا لیکن ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کے قریب اقلیتی آبادی کے مقابلے میں اس طرح کی کوشش کو بہت معمولی قدم کہا جا سکتا ہے۔ بہار میں بھی اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس ریاست میں اردو کے ذریعے مڈل اسکول ایجوکیشن دینے کے واسطے بہار مدرسہ بورڈ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بورڈ کے رجسٹر میں ۲۰ ہزار سے زیادہ اساتذہ ہیں۔ اترپردیش اور بہار دونوں ریاستوں میں مدرسوں کی کافی تعداد ہے جہاں اردو میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہندی بولی جانے والی ریاستوں میں ہماچل پردیش وہ واحد ریاست ہے جہاں اردو کی تعلیم پانے والے ۹۵ فی صد طلبا غیر مسلم اسکولی طلبا ہیں جبکہ دیگر ریاستوں میں دوسری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد مقابلتاً بہت کم ہے۔

آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر اور مغربی بنگال کے چند خطوں میں ہی ہائی اسکول کی سطح پر اردو کے ذریعے تعلیم کی سہولتیں ہیں۔ ان ریاستوں میں بالائی سطح کی تعلیم میں بطور ایک مضمون تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد شمالی ہند کی ریاستوں کے مقابلے زیادہ ہے۔ جنوبی ہند کی ان تمام ریاستوں میں پرائمری اور مڈل درجات کی اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے لیے سرکاری امداد سے چلنے والے ادارے موجود ہیں۔ اس طرح کے مدرسوں کی تعداد کافی ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں اردو کی پوزیشن شمالی ہند کی ریاستوں کے مقابلے بہتر ہے۔

البتہ موجودہ صورتِ حال ۱۹۷۰ء کے دہائیے سے قبل کے ہندوستانی کثیر لسانی منظر نامے کی اردو پوزیشن کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کی تفاصیل میں جائے بغیر، اس کے عارضی اعداد و شمار ہمت افزا ہیں اور ان سے

اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں اردو زبان کی توسیع و اشاعت کے امکانات ہیں اور یہ زبان اسی طرح سے عوامی رابطے کی زبان بن سکتی ہے جیسا کہ انیسویں صدی کے آخر تک اسے یہ مرتبہ حاصل رہا ہے۔

اس طرح ہندوستان کے کثیر لسانی منظر نامے میں ایک بار اردو پھر زور پکڑ رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں اردو اور ہندی کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اردو کی موجودہ عملی افادیت اردو زبان و ادب کی بہتر صورتِ حال کے لیے ایک امید افزا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔

ملک کے کچھ حصوں میں سرکار کی فراخدلانہ پالیسی کے تحت اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ عوام نے اردو کے ذریعے سے مواصلات میں دلچسپی لی ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے حالات میں تبدیلی آئے گی اور اردو کو ہمارے ملک میں اس کا جائز مقام مل سکے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ اردو بولنے والی آبادی زیادہ تر شہری علاقوں میں مرکوز ہے، لہٰذا سماجی و ثقافتی رجحانات اور شہروں کے اکثریتی طبقات کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں اردو کے لیے موافق فضا پیدا ہوگی۔ اخبارات، میگزین، رسائل، ریڈیو اور ٹی۔ وی پروگراموں اور سیریلوں میں اُردو اسلوب نگارش کا بڑھتا ہوا استعمال ایک حوصلہ افزا صورتِ حال ہے اور اس طرح وسیع تر معنوں میں اردو عوامی رابطے کی زبان کے طور پر مقبولِ عام ہوتی جا رہی ہے۔

آخر میں ایک اہم ترین بات یہ عرض کرنی ہے کہ اکادمیاں، یونیورسٹیاں اور دیگر تمام ادارے جو کہ اردو کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے کام سے وابستہ ہیں، ایک لحاظ سے ایک خامی کا شکار ہیں اور وہ یہ کہ انھوں نے اعلا سطح کا تحقیق کا کام تو ضرور کیا ہے تاہم بنیادی سطح پر فروغ اردو کے لیے کوئی تسلی بخش کام نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا ان اداروں کو اس نقطۂ نظر سے غور و خوض کرنا ضروری ہے اور تمام سطحوں پر تعلیم کے لیے مربوط اور موثر درسی مواد فراہم کرنے کے لیے ایک یکساں منصوبہ بنانا چاہیے۔ یہ کام کم سے کم ثانوی سطح کی تعلیم کے لیے تو ہو ہی جانا چاہیے۔ اس طرح کے مواد کی کمی اردو کو بہ حیثیت دوسری زبان سیکھنے والوں کی دلچسپی کو کم کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایسے الفاظ کو جمع کرنا چاہیے جو کہ فلم اور عوامی

ابلاغ کے ذرائع مثلاً اخبارات، ریڈیو، ٹی۔وی پروگراموں میں استعمال ہوتی ہے اور اس مواد کی مدد سے غیر ہندی داں لوگوں کے لیے مواد تیار کرنا چاہیے۔ اس طرح کی کوشش سے اردو سیکھنے والے اردو کے قریب آسکیں گے کیونکہ وہ روزانہ ان ذرائع ابلاغ کے ذریعے اردو اسلوب، تہذیب اور روزمرّہ سے دوچار ہوتے ہیں اس لیے انھیں اچھی اردو کا اسلوب نگارش سیکھنے میں مدد ملے گی۔ مزید برآں ہندی کی مدد سے الفاظ کے باریک فرق اور ادبی کارناموں کو غیر اردو داں حضرات کو بتانا چاہیے اور جہاں علاقائی زبانوں کا دخل ہو وہاں ان کے توسّط سے بھی مشکل الفاظ اور ادب کی باتوں کا فرق واضح کرنا چاہیے، اگرچہ اردو کے علاوہ اردو کے الفاظ کو دوسرے رسم الخط میں لکھنے کو پسند نہیں کیا جاتا تاہم اس نئے مفہوم کے ساتھ اس پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اقدامات سے دوسری زبانوں کے بولنے والوں کو سرزمینِ ہند پر فروغ یافتہ اردو کے عظیم ورثے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ کام باقاعدہ منظم طور پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے اردو کے علمی اداروں کے درمیان تال میل قایم ہونا ضروری ہے اردو کے اسکالروں اور بہی خواہوں کو بھی اس کام سے جوڑنا ضروری ہے۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز واقع میسور اپنے علاقائی مراکز واقع لکھنؤ اور پٹیالہ کے توسط سے بالعموم اور ہماچل پردیش میں سولن کے مقام پر واقع مرکز کے توسط سے بالخصوص اردو اکادمیوں اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے ڈائریکٹوریٹ کے ساتھ رابطے بڑھا رہا ہے اور اس مقصد کے لیے اس انسٹی ٹیوٹ نے مادری زبان والے اردو ٹیچروں کے لیے تجدیدی نصابات کا اہتمام کیا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ان اداروں کے ساتھ مل کر نچلی سطح پر مبنی دوسری زبان سیکھنے والوں کے لیے درسی مواد تیار کر سکتا ہے۔

اب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام خصوصیات اور زبان کے تئیں سوز و گداز کے باوجود، اردو ملک کی قابلِ قدر زبان ہونے کے ناطے ملک کے کثیر لسانی منظر نامے سے اور مادرِ وطن سے کسی بھی صورت میں خارج نہیں کی جا سکتی۔

اردو زبان پہلے بھی، اب بھی اور مستقبل میں بھی ایک مقتدر زبان کی حیثیت

سے باقی رہے گی۔ اس کی شاندار ادبی روایات ماضی، حال اور مستقبل میں زندہ رہیں گی۔ اس کے ارتقاء و اطوار، اس کی شیرینی ہر زمانے میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ یہ عوام کی محبوب زبان ہے اور اس کی شانِ محبوبی کبھی بھی زوال پذیر نہیں ہوگی۔ اس کی شانِ محبوبیت کو قائم رکھنے کی بڑی ذمہ داری اس ملک میں ان لوگوں پر ہے جو اس کے فروغ کے لیے ذمہ دار ہیں۔ غیر اردو داں حضرات میں اردو محاوروں کے استعمال اور انھیں جاننے کی بڑھتی خواہش خود بخود اس زبان کو مستحکم عوامی رابطے کی زبان بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ یہ ایک لسانیاتی نظریہ ہے کہ زبانیں عوامی کوششوں سے وجود میں آتی ہیں اور انھیں کے دم پر انھیں کے لیے فروغ پاتی ہیں۔ ریاستی پالیسیاں اپنی پسند سے صرف منصوبہ بندی کر سکتی ہیں۔ اردو میں تکنیکی اور سائنسی معلومات اور اصطلاحات کی کمی ہے اور اس معاملے میں ہندی اور دوسری زبانوں کی صورتِ حال بھی کوئی بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس پس منظر میں اگر اردو عوام کی زبان ہونے کا یقین دلا دے، جیسا کہ آہستہ آہستہ یہ صورتِ حالات رونما ہو رہی ہے، تو یہ اپنا مقصد پا سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بہتر قیادت درکار ہے جو اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے مناسب مواقع اور سہولتیں فراہم کرا سکتی ہے، بھلے ہی یہ دوسرے درجے کی سرکاری زبان ہو تاہم اس وقت یہ زبان ہر جگہ رائج ہے۔

مترجم۔ عادل صدیقی

معالجات

(جلد اوّل تا چہارم)

حکیم وسیم احمد اعظمی

طبیہ کالجوں کے طلبہ واساتذہ کے لیے اہم نصابی سلسلہ

جلد اوّل	(امراض نظام اعصاب ودوران خون تنفس)	قیمت -/104
جلد دوم	(امراض نظام ہضم وتولید وتناسل)	قیمت -/128
جلد سوم	(حمیات امراض متعدی)	قیمت -/120
جلد چہارم	(امراض جلد ومتعلقات جلد)	قیمت -/100

عمدہ کتابت ومعیاری طباعت کے ساتھ مجلد ڈیلکس اڈیشن مع رنگین گردپوش

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت۔

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 066

فون : 6179657, 6103938, 6103381 فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

غلام نبی خیال

اثر صہبائی
ایک گم گشتہ شاعر

سرزمینِ کشمیر میں جن اُردو شعرا نے رواں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں سارے برصغیر کو اپنے فن کی خوشبوؤں سے معطر کر دیا ان میں خواجہ عبدالسمیع پال المتخلص بہ اثر صہبائی ایک جانا پہچانا نام ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں علامہ اقبال کا ڈنکا بج رہا تھا اور دُنیائے شاعری پر فانی بدایونی، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی، تاجور نجیب آبادی، سیماب اکبرآبادی، اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، مجاز لکھنوی اور فراق گورکھپوری راج کر رہے تھے۔

ان دنوں جن شعرا کا خاص طور پر کشمیر کے ساتھ وطنی اور فکری لگاؤ تھا ان میں اقبال کے علاوہ خوشی محمد ناظر، حفیظ، محمد دین فوق، مولانا ظفر علی خان، امین حزیں اور اثر صہبائی خاص طور پر شامل تھے۔

اثر صہبائی کے مداحوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، سلیمان ندوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی کے نام آتے ہیں عبدالقادر سروری کے بقول "۱۹۳۰ء کے بعد عرصے تک وہ مقبول شاعروں میں شامل تھے۔"

اثر صہبائی (۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۶۳ء) اگرچہ علامہ اقبال اور محمد دین فوق کی جائے پیدائش سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا علمی سفر ان کی ملازمت کے دوران ہی ایک نیا موڑ لے کر کشمیر ہی میں کمال کی منزلوں تک پہنچ پایا۔

اثر خود بھی کشمیری الاصل تھے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں

آبسے تھے۔ لاہور میں ایل ایل بی کی ڈگری لینے کے بعد انھوں نے جموں کے سرحدی شہر رنبیر سنگھ پورہ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا جس کے ساتھ انھیں ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ اسی لیے شکایت کرتے ہیں کہ "عدالتی فضائیں میرے لیے نہایت عجیب و غریب ثابت ہوئیں۔ میرے خیال میں انسان کی تمام ذہنی، اخلاقی اور رُوحانی بیماریوں کا اجتماع عدالتوں کے احاطوں میں ہوتا ہے۔ یہاں صرف اہلِ مقدمات ہی مریض نہیں ہوتے بلکہ ان کے ڈاکٹروں کا حال اُن سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ وکیلوں اور ججوں میں بھی ایسے انسان بہت کم نظر آتے ہیں جن کی اخلاقی اور روحانی حسیں بیدار ہوں۔"

جموں میں کچھ عرصے تک رہنے کے بعد آثر صہبائی ۱۹۳۴ء میں سری نگر چلے آئے۔ انہی دنوں آثر کو کیفی دہلوی کی صحبت کا شرف حاصل ہوا جو حکومتِ کشمیر میں نائب خارجہ سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔

آثر اپنے مجموعۂ کلام "بامِ رفعت" میں اپنے وطن کی زبوں حالی کا یوں اظہار کرتے ہیں: "سرزمینِ کشمیر میرے آبا و اجداد کا وطن ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے یہی ایک آواز رہ رہ کر میرے سینے میں اٹھتی تھی کہ جب میں اس رنگین و شاداب وادی کے بدنصیب باشندوں کو دیکھتا تو میرا خون کھولتا۔ وادی کے حقیقی مالک یعنی عوام انتہائی عسرت اور ذلّت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ صبح و شام کی محنت اور مشقّت کے باوجود ان سوختہ قسمت انسانوں کو قوتِ لایموت تک بھی مُشکل سے میسر آتی تھی۔

"ظلم و استبداد کے خلاف میرے دل و دماغ ہمیشہ سرگرم احتجاج رہے ہیں لیکن کشمیری مسلمانوں کی بے چارگی اور مظلومیت کا مجھے شدید اور گہرا احساس تھا۔ میری اور اُن کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا تھا۔ قیامِ کشمیر کے دوران میں سرمایہ داری، سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت اور غیر ملکی تسلّط سے مجھے شدید نفرت ہوگئی ؎

" آہ مظلوم کی سنتا نہیں فریاد کوئی
ظلم والوں کی نہیں روکتا بیداد کوئی
میں نے مظلوم کو ظالم سے چھڑانا چاہا "

بارہ تیرہ برس کی وکالت کے بعد حکومتِ کشمیر نے انھیں سرکاری وکیل مقرر کر لیا اور اس طرح انھوں نے مستقل طور پر سری نگر میں سکونت اختیار کر لی۔

اُن دنوں کشمیر کی ادبی اور ثقافتی محفلیں کشمیر کے وزیر داخلہ آثر لکھنوی اور ریاستی محکمۂ تعلیم کے دو سرکردہ افسروں اور اصحابِ دانش ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی وجہ سے آباد تھیں۔ آثر صہبائی کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر اس موافق ماحول کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ البتّہ اپنی منظومات پر وہ مولانا تاجور نجیب آبادی اور اپنے برادرِ اکبر امین حزیں ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں وہ پھر تبدیل ہو کر جموں میں قیام پذیر تھے کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے انسان کُش ہنگاموں کو دیکھ کر وہ بھاگ کر سیدھے سیالکوٹ چلے گئے اور زندگی کے آخری تین چار سال لاہور میں گزارنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں انتقال کر گئے۔

آثر صہبائی کے جو مجموعے شائع ہوئے اُن میں "جامِ صہبائی" (۱۹۲۷ء) "جامِ طہور" (۱۹۳۷ء) " راحت کدہ" (۱۹۴۳ء) اور غزلیات اور منظومات کا مجموعہ "خمستان" "روحِ صہبائی" اور "بامِ رفعت" شامل ہیں۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام جو اُن کی وفات کے وقت کئی مجموعوں کی شکل میں موجود تھا غالباً زمانے کی دست برد کا شکار ہو کے رہ گیا۔ آثر صہبائی کی نعتوں کا ایک مجموعہ بھی "حضور سرورِ کائنات" ، انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ یہ نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شاہی بھی اُسی کی ہے فقیری بھی اُسی کی
تو نے نگہِ لُطف و کرم جس پہ بھی ڈالی
اے رحمتِ کونین و سراپائے محبّت
دشمن نے بھی گالی کے عوض تجھ سے دُعا لی

○

کسی کے آگے نہ خم ہو سکی مری گردن
کسی طرح میری آواز آج تک نہ دبی
یہ فیض ہیں سب اُسی ذات کے لقب جس کا
ہے مکّی و مدنی ، ہاشمی و مُطلبی
اُسی کے فیض سے ذرّے بھی برق پارے ہیں
اُسی کے عشق میں سرشار چاند تارے ہیں

"خمستان" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں سیالکوٹ سے شائع ہوا جس پر سید سلیمان ندوی اور پنڈت کیفی دہلوی نے مبسوط اور جامع مقدمے اور تاثرات لکھے لیکن جب اس مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا تو نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ دونوں تاریخی نوشتے کتاب سے خارج کر دیے گئے۔

اثر کا کہنا ہے کہ ابتدائی ایام میں انھوں نے اردو شاعری کا مطالعہ میر، غالب اور اقبال کے کلام سے شروع کیا اور ٹیگور کی گیتانجلی کے اردو ترجمے نے بھی انھیں بہت متاثر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حافظ، خیام، رومی، ابوسعید ابوالخیر اور سرمد شہید بھی مختلف ادوار میں اپنے اپنے مخصوص اندازِ فکر سے انھیں متاثر کرتے رہے۔ البتہ مغرب کا کوئی بھی شاعر انھیں خاص طور پر محبوب نہیں رہا ہے اگرچہ مغربی شعر و ادب کے اثرات اُن کے کلام میں نظر آتے ہیں۔

اثر صہبائی نے فلسفے میں ایم۔ اے کی ڈگری لی تھی لہٰذا اس مضمون کے ساتھ اُن کی دلچسپی ایک فطری عمل تھی۔ اس ضمن میں شنکر اچاریہ اور ہنری برگسان ان کے پسندیدہ فلسفہ دان رہے اور مذہبی شخصیات میں شری کرشن، مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰ اُن کے لیے مثالی انسانوں کی مثالی انسانیت کے علمبرداروں کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ان تمام عالمی شخصیات کے علاوہ جس جوشِ عقیدت اور جذبۂ اُلفت کا اظہار اثر نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں اپنے کلام میں کیا ہے وہ ان کے والہانہ پن کی ایک قابلِ تحسین مثال ہے۔

اثر صہبائی کی شاعری میں اگرچہ قاری کو بار بار غالب کی سرمستی اور اقبال کی سرشاری کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن ان کا اپنا حُسنِ فن اور اظہار کی مشاقی ان کے کلام کو کئی ہم عصر شعرا سے الگ ایک انفرادی مقام کا مالک بنا دیتی ہے۔

غالباً یہ اثر صہبائی کے کلام کی عدم دستیابی کا نتیجہ ہے کہ نقادوں اور محققوں کو اس اہم شاعر کے کلام کو از سر نو زیر بحث لانے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔ اصل میں اثر کا جو کلام مختلف موقعوں پر شائع ہوا وہ سارے مجموعے تقسیم ہند سے قبل ایک محدود اشاعت کے ساتھ منظرِ عام پر آئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس قسم کے علمی اور ادبی خزینے بھی پُر آشوب اور ہولناک ماہ و سال کے خون خرابے میں ضائع ہو کر رہ گئے اور پھر دوبارہ ان کی دستیابی ممکن نہیں ہو سکی۔

آثر صہبائی کا کلام اگرچہ چند مختصر مجموعوں پر ہی مشتمل ہے لیکن ان کے فن کو بقامت کہتر او ربقیمت بہتر کہا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام میں نظمیں، غزلیات اور رباعیات و نعت شامل ہیں۔

آثر کے کلام میں کسی نہ کسی صورت میں اساتذہ یا ہم عصر شعرا کا اثر مختلف رنگوں کے ساتھ منعکس ہوکر اور ان کے اپنے انفرادی رنگ میں نکھر کر قدم قدم پر جلوہ نما نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

گو بحرِ حوادث کا تلاطم نہ گیا
بربط سے مرے لطفِ ترنم نہ گیا
وہ زندہ دلِ دہر ہوں میں صہبائی
مر کر بھی مرے لب سے تبسم نہ گیا

٥

دل خون ہوا ہے رنج سہتے سہتے
آنسو دریا ہوئے ہیں بہتے بہتے
تاریکیِ شب یونہی رہے گی ہمدم!
سو جائیں گے ہم فسانہ کہتے کہتے

پہلی رباعی میں اقبال کے اُس مشہور قطعے کی اثر پذیری واضح نظر آتی ہے جس کے آخری دو مصرعے یوں ہیں ؎

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اور دوسری رباعی اس مشہور اُردو شعر کی گونج ذہن میں پیدا کردیتی ہے کہ ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اب آثر صہبائی کے چند چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا حسن پھوٹ پھوٹ کے نکلا نقاب سے
کیا خوب بے نقاب ہوئے ہو نقاب میں

ہے چپ سی لگی ہوئی اثرؔ کو
معلوم نہیں کہ بات کیا ہے

تم اب دل کو پوچھ رہے ہو تم کو کیا معلوم نہیں
وہ شیشہ تو مدّت گذری ٹوٹ کے چکنا چور ہوا

وہ میری خلوتِ دل میں ہے انجمن میں نہیں
بہار جو مرے پہلو میں ہے چمن میں نہیں

کچھ اس طرح سے میرے دل وجاں پہ چھا گئے
دُنیا تو کیا وہ مجھ کو بھی مجھ سے چھپا گئے
اللہ شب کے گریۂ پیہم کی لذتیں
تارے تمام ٹوٹ کے دامن میں آگئے

دُنیائے رنگ وبو میں رہا رنگ وبو سے پاک
آغوشِ گل میں صورتِ شبنم رہا ہوں میں

اپنی تو رات عالمِ مستی میں کٹ گئی
شب بھر ترے خیال کی ساقی گری رہی

اثرؔ صہبائی اپنے فلسفۂ حیات کی مختصراً یوں توضیح کرتے ہیں "مجھے اُن تمام انسانوں سے محبت ہے جن کی زندگیاں اشاعتِ حق و صداقت اور خدمتِ خلق کے لیے وقف رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب میری زندگی اور شاعری کا اہم ترین عنصر بن چکا ہے۔ میرے نزدیک مذہب کی روح حق جوئی، حق گوئی اور حق پرستی ہے۔ اس اعتبار سے میں جملہ علوم وفنون پر مذہب کو حاوی اور محیط سمجھتا ہوں۔ یوں بھی

مذہب انسان کے بلند ترین افکار پاکیزہ ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ میرے دل میں سائنس کا احترام ہے۔ فلسفہ اور شعروادب سے مجھے انتہائی شغف ہے۔ لیکن وہ راحت و تسکین، وجد و مستی اور نور و سرور جو مذہب سے روح کو حاصل ہوتا ہے دیگر علوم و فنون میں ناپید ہے۔ جذبۂ عشق اور حق پرستی کے بغیر تمام سیاست و حکومت محض مکر و جبر، تمام فلسفہ و حکمت ایک دشتِ بے آب و گیا، تمام شعروادب بے رنگ و نور اور تمام ریاضت و عبادت محض جسمانی کوفت ہے۔"

قومی اُردو کونسل کی مطبوعات

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اُردو سکھانے والی کتاب

اُردو تصویری لغت مع ہندی

جدید طریقوں سے بنائی گئی کتاب اُردو سیکھنے کے شوقین حضرات کے لیے نہایت عمدہ تحفہ۔ تصاویر اور ہندی کی مدد سے اُردو خود بخود سیکھی جاسکتی ہے۔ یہ اپنی طرز کی بالکل اچھوتی کتاب ہے۔ بہترین کتابت اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ۔

قیمت : 30/- روپے

سائز : 23x38/8

صفحات : 252

کتب فروش اور کتب خانوں کے لیے اسپیشل کمیشن، آرڈر فوراً ارسال کریں۔

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔۱، ونگ۔6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110 006

فون : 6103381, 6103938, 6179657 : فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

اُردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

جس میں پہلی بار اُردو میں
ریڈیو اور ٹی وی کی تاریخ بیان کی گئی ہے

اور

ان میں اُردو کے استعمال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات : 646 قیمت : 200 روپے

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006

فون : 6103381, 6103938, 6179657 فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

فہرستِ کتب

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی مطبوعات

ادبیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
1.	آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	=/۴۳
2.	ابوالکلام آزاد۔شخصیت، سیاست پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	=/۲۱
3.	ابوالکلام آزاد۔ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	=/۵۸
4.	اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	=/۱۲۰
5.	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (تیسری طباعت)	احتشام حسین	=/۴۰
6.	اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (عہد مرزا و میر تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	=/۲۲
7.	اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک) ترمیم واضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	=/۳۰
8.	اردو کی کہانی	احتشام حسین	=/۲۱
9.	اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	=/۳۰
10.	اردو ادب کی ساجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	=/۹۸
11.	اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	=/۱۵۰
12.	اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	=/۲۰۰
13.	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	=/۴۰
14.	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	ڈاکٹر غلام ایم لعل زاد / ڈاکٹر شعیب اعظمی	=/۸۰
15.	ارنیسٹ ہیمنگوے حیات وفن کا تنقیدی مطالعہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	۸/۴۰

16.	امریکی ادب کا مختصر جائزہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	۵۴/=
17.	انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	۱۵/=
18.	انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	۹/=
19.	انشا کا ترکی روزنامچہ	سیّد محمد نعیم الدین	۴٫۵۰
20.	انیس کے سلام	علی جواد زیدی	۶۰/=
21.	انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	۳۶/=
22.	انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	۴۰/=
23.	برنارڈ شا	عبدالمغنی	۳۵/=
24.	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	۱۸/=
25.	بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	۵۸/=
26.	پشکن (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	۶۰/=
27.	پھول بن	ابن نشاطی	۵۴/=
28.	تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / پروفیسر نذیر احمد	۱۴/=
29.	تالستائے	ڈاکٹر محمد یٰسین	۴۶/=
30.	تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	۱۳۵/=
31.	جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۸۰/=
32.	جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن	ظفر محمود	۳۸/=
33.	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
34.	چے خف (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	۱۰/=
35.	حیات جاوید (چوتھی طباعت)	الطاف حسین حالی	۱۶۷/=
36.	خسرو شناسی (تیسری طباعت)	ظ۔ انصاری / ابوالفیض سحر	۸۰/=
37.	دانتے	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	۸٫۲۵
38.	دستنبو (غالب)	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (مترجم)	۱۲/=
39.	درس بلاغت (تیسری طباعت)	ترقی اردو بیورو	۴۷/=
40.	قدیم اردو نظم (۱)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۴۰/=
41.	دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	۴۲/=
42.	دکنی ہندو اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	۱۵٫۵۰
43.	دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیّدہ جعفر	۴۵/=
44.	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	۱۷/=
45.	دیوان آبرو	پروفیسر محمد حسن	۲۵/=
46.	دیوان حسرت عظیم آبادی	ڈاکٹر اسماء سعیدی	۱۰۰/=

47.	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	۱۲/=
48.	ڈاکٹر ذاکر حسین	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (مرتبہ)	۷۰/=
49.	ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۳۴/=
50.	رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	۶۴/=
51.	رباعیات انیس	علی جواد زیدی (مرتب)	۸۵/=
52.	زندگانی بے نظیر	سید محمد عبدالغفور شہباز / سید محمد حسنین	۱۹/=
53.	ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اوّل: نظری مباحث	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	۱۸۰
54.	سب رس کے حروف (صرفی مطالعہ)	آصفہ بیگم	۹/۵۰
55.	سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	۷۷/=
56.	شعریات (تیسری طباعت)	ارسطو/شمس الرحمٰن فاروقی	۶۴/=
57.	شعر شور انگیز (اوّل)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۵۰/=
58.	شعر شور انگیز (دوم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۳۰/=
59.	شعر شور انگیز (سوم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۵۰/=
60.	شعر شور انگیز (چہارم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷۰/=
61.	صحیفہ خوش نویساں	مولوی احترام الدین احمد شاغل	۱۲/=
62.	عربی ادب کی تاریخ (۱) (تیسری طباعت)	پروفیسر عبدالحلیم ندوی	۷۷/=
63.	عربی ادب کی تاریخ (۲)	پروفیسر عبدالحلیم ندوی	۸۴/=
64.	عربی ادب کی تاریخ (۳)	پروفیسر عبدالحلیم ندوی	۵۵/=
65.	غزل اور غزل کی تحریک (دوسری طباعت)	ڈاکٹر اختر انصاری	۱۸/=
66.	فسانۂ آزاد (جلد اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۱۰۰/=
67.	فسانۂ آزاد (جلد دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۵/=
68.	فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۷/۵۰
69.	فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۷/۵۰
70.	فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۵۰/=
71.	فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۵۰/=
72.	فکر و تحقیق (۱)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
73.	فکر و تحقیق (۲)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
74.	فکر و تحقیق (۳)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
75.	فکر و تحقیق (۴)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
76.	فکر و تحقیق (۵)	قومی اردو کونسل	۲۰/=

77.	فکر و تحقیق (۶)	قومی اردو کونسل	۲۰/=
78.	فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون ۱۹۹۷	قومی اردو کونسل	۳۰/=
79.	فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر ۱۹۹۷	قومی اردو کونسل	۳۵/=
80.	فکر و تحقیق (۹) جنوری تا جون ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۵۰/=
81.	فکر و تحقیق (۱۰) جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۴۰/=
82.	فکر و تحقیق (۱۱) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۴۰/=
83.	فکر و تحقیق (۱۲) جنوری تا مارچ ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۴۰/=
84.	فکر و تحقیق (۱۳) اپریل تا جون ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۲۵/=
85.	فکر و تحقیق (۱۴) جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۲۵/=
86.	فکر و تحقیق (۱۵) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۲۵/=
87.	فکر و تحقیق (۱۶) جنوری تا مارچ ۲۰۰۰	قومی اردو کونسل	۲۵/=
88.	فیودر دستوئیفسکی	ظ۔ انصاری	۵۲/=
89.	قومی تہذیب کا مسئلہ	پروفیسر سید عابد حسین	۵۴/=
90.	قطب مشتری	اسد اللہ وجہی / ڈاکٹر حمیرہ جلیلی	۴۸/=
91.	قلم کا مزدور پریم چند	مدن گوپال	۲۰/=
92.	کاشف الحقائق	سید امداد امام اثر / پروفیسر وہاب اشرفی	۱۴۵/=
93.	کائنات جلیل	علی احمد جلیلی	۸۰/=
94.	کلیات ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۳۴/=
95.	کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	۱۳۵/=
96.	کلیات سراج (ڈی لکس)	سراج اورنگ آبادی	۴۸/=
97.	کلیات سودا (حصہ اول)	پروفیسر محمد حسن	۴۸/=
98.	کلیات سودا (حصہ دوم)	پروفیسر محمد حسن	۱۳/=
99.	کلیات عیش	ڈاکٹر حبیبہ بانو	۸۰/=
100.	کلیات فانی (طبع ثانی)	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۹۳/=
101.	کلیات قلی قطب شاہ	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۵۷/=
102.	کلیات میر	ظل عباس عباسی	زیر طبع
103.	لمعات بصیرت	رگھوناتھ کھئی	۴۰/=
104.	مثنوی بہرام و گل اندام	ابن سعید اختر	۶۶/=
105.	مجموعہ نغز (تذکرہ شعرائے اردو)	قدرت اللہ قاسم	۵۰/=

106.	مسدود راہیں	زاہدہ زیدی	۱۲۶/=
107.	مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات	پروفیسر محمد حسن	۲۸/=
108.	مقالات مسعود	پروفیسر مسعود حسین خاں	۱۸/۵۰
109.	مولیر	پروفیسر ثریا حسین	۱۵/=
110.	نالاڈیار (کلاسیکی تامل اشلوکوں کا مجموعہ)	غازی حمید اللہ خاں	۴/۷۵
111.	واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات	کوکب قدر سجاد علی میرزا	۹۷/=
112.	وضاحتی کتابیات (جلد اول ۱۹۷۶ء)	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۷۳/=
113.	وضاحتی کتابیات (جلد دوم) ۷۸-۱۹۷۷ء	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۷۳/=
114.	وضاحتی کتابیات (جلد سوم)	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۱۳۵/=
115.	ہندوستانی مسلمان	پروفیسر محمد مجیب / سید محمد مہدی	۲۵۸/=
116.	ہندی ادب کے بھگتی کال میں مسلم ثقافت کے اثرات (دوسری طباعت)	سید اسد علی / ڈاکٹر ماجدہ اسد	۳۲/=
117.	یادبود غالب	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۲۱/=

تاریخ۔ جغرافیہ۔ سیاست۔ ثقافت

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
118.	آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے / کشور سلطان	۶۰/=
119.	آزادی	جان اسٹورٹ مل / سعید انصاری	۵۲/=
120.	آزاد ہندوستان (حصہ دوم) (تیسری طباعت)	ایس۔ ایل۔ کھنہ	۲/=
121.	ابتدائی علم شہریت	ایس، این، چٹوپادھیائے / شریف الحسن نقوی	۴/۵۵
122.	ارتھ شاستر	آچاریہ چانکیہ / شان الحق	۱۰۹/=
123.	اسلامی تہذیب و تمدن	عمادالحسن آزاد فاروقی	۱۴/=
124.	اسلامی سماج	ریوبن لیوی / مشیر الحق	۶۰/=
125.	اکبر سے اورنگ زیب تک (طبع ثانی)	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	۹۳/=
126.	البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	۱۱/=

.127	انقلاب ۱۸۵۷ء (تیسری طباعت)	مرتب: پی۔ سی۔ جوشی	۷۵/=
.128	انقلاب فرانس	جے۔ ایم۔ تھامسن / ڈاکٹر محمود حسین	۱۳۰/=
.129	اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	۲۸/=
.130	بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	۱۴/=
.131	برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	۳۶/=
.132	تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	۱۰/=
.133	تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	۱۰/۵۰
.134	تاریخ تحریک آزادیٔ ہند (دوسری طباعت) (حصہ اوّل)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	۱۰۳/=
.135	تاریخ تحریک آزادیٔ ہند (حصہ سوم)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	۷۵/=
.136	تاریخ تعلیم ہند	جے۔ پی۔ پٹنائک / سید نور اللہ	۱۱۱/=
.137	تاریخ تمدن ہند	پروفیسر محمد مجیب	۱۱/=
.138	تاریخ ٹیپو سلطان	محب الحسن / حامد اللہ افسر	۱۳۰/=
.139	تاریخ جہانگیر (دوسری طباعت)	بینی پرشاد / رحم علی الہاشمی	زیر طبع
.140	تاریخ شاہجہاں (دوسری طباعت)	بنارسی پرشاد سکسینہ / سید اعجاز حسین	زیر طبع
.141	تاریخ فلسفہ سیاسیات (طبع ثانی)	پروفیسر محمد مجیب	۹۷/=
.142	تحریک آزادیٔ ہند	ظہور محمد خاں	۲/۲۵
.143	تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۶۰/=
.144	تذکرہ دربار حیدرآباد	رمن راج سکسینہ	زیر طبع
.145	جامع تاریخ ہند	محمد حبیب / خلیق احمد نظامی	زیر طبع
.146	جدید سیاسی فکر	سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۱۴/۲۵
.147	جدید ہندوستان کے معمار (دوسری طباعت)	آئی۔ سی۔ ایچ۔ آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد	۱۴/=
.148	جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی	۱۹/=
.149	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۴۷/=
.150	جنوبی ہند کی تاریخ زمانہ ماقبل تاریخ سے وجیہ نگر کے زوال تک	آئی، سی، ایچ، آر / آر، کے، بھٹناگر	۱۱۴/=
.151	چولا راجگان (طبع ثانی)	کے، ایل، نیل کنٹھ شاستری	۲۰۹/=
.152	حکومت اور آئین (چھٹی طباعت)	مترجم ڈاکٹر قیصر شمیم	۲/=
.153	حیدرآباد کے روزناموں کی ادبی خدمات	سید ممتاز مہدی	۹۲/=

154.	حیدر علی (دوسری طباعت)	نریندر کرشن سنہا / اقتدار حسین صدیقی	۷۲/=
155.	خلجی خاندان	کے۔ ایس۔ لال / محمد یٰسین مظہر صدیقی	۸۸/=
156.	دکن کی قدیم تاریخ	پروفیسر یزدانی	۴۹/=
157.	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی / رحم علی الہاشمی	۸۸/=
158.	رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا / کیلاش چندر چودھری	۹/۲۵
159.	ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی ۱۸۰۰تا۱۹۰۰	سید محمد جواد رضوی	۲۰/=
160.	سفر نامہ فرہنگ سیر طالبی فی بلاد افرنجی	مرزا ابو طالب اصفہانی / ثروت علی	۳۲/=
161.	سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ	محمد حبیب / بیگم افسر عمر سلیم خاں	۱۳/=
162.	سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت (طبعِ ثانی)	ابن حسن، آئی اے ظلّی	۸۶/=
163.	سویت یونین کا سیاسی نظام	ظفر امام	۷۴/=
164.	شہیدانِ آزادی (حصہ اوّل)	پی، این۔ چوپڑا / بھگوت سنگھ	۱۱۳/=
165.	شہیدانِ آزادی (حصہ دوم)	پی، این۔ چوپڑا / سید تفضل حسین	۱۰۰/=
166.	شیر شاہ سوری اور اس کا عہد	الکا رنجن قانون گو / رام آسرا شرما	۱۳۵/=
167.	صوبائی خود مختاری کی ابتدا	ایس گومر / بشیشور پرشاد	۱۲/۵۰
168.	ظہیر الدین محمد بابر (دوسری طباعت)	ایل، ایف، رش بروک ولیمز / رفعت بلگرامی	۱۳/=
169.	علی وردی اور اس کا عہد	کالی کنکر دتا / عبدالاحد خاں خلیل	۸۶/=
170.	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	۱۱۰/=
171.	قدیم ہندوستان کی تاریخ	راما شنکر ترپاٹھی	۱۱۴/=
172.	قدیم ہندوستان میں تعلیم	اے۔ ایس۔ التکر / ابو یوسف	۳۵/=
173.	قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں	ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی / بال مکند عرش ملسیانی	۷۳/=
174.	قدیم ہندوستان میں شودر (طبعِ ثانی)	رام سرن شرما / جمال الدین محمد	۸۲/=
175.	مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا / علی جواد زیدی	۶۰/=
176.	مغل دربار کی گروہ بندیاں اور سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر / ڈاکٹر قاسم صدیقی	۲۲/=
177.	مغل ہندوستان کا طریقہ زراعت	عرفان حبیب / جمال محمد صدیقی	۱۱۹/=
178.	مغلوں کا نظام مالگزاری ۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک (طبعِ ثانی)	نعمان احمد صدیقی / ایس۔ نبی ہودی	۵۸/=
179.	مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ایس۔ این۔ ترپاٹھی / ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	۳۷/=

180.	مراد آباد۔ تاریخ اور صنعت	تاباں نقوی	۱۲/=
181.	مسیر طالبی (سفر نامہ)	ابو طالب اصفہانی / ثروت علی	۳۲/=
182.	منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	۴۵/=
183.	ناوابستگی	پروفیسر رشید الدین خاں / ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ مہدی	۳۷/=
184.	نظام حکومت اور سماجی زندگی	کے اے نیل کنٹھ شاستری	۱۱۸/=
185.	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	سرمور ٹیمر / زبیر رضوی	۴۵/=
186.	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی	ٹی۔ وی۔ مہالنگم / نیل کنٹھ شاستری	۴۱/=
187.	ہمایوں نامہ	گلبدن بیگم / عثمان حیدر مرز	۱۱/=
188.	ہندوستان سرزمین اور عوام	نارائنی گپتا / ایس۔ کے۔ سنگھ	۲/=
189.	ہندوستان کا شاندار ماضی	اے، ایل، باشم / غلام سمنانی	۱۴۵/=
190.	ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کے مورخین	پروفیسر محب الحسن / مسرور علی ہاشمی	۴۵/=
191.	ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بمل پرساد / محمد محمود فیض	۱۲/۲۵
192.	ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	۴۶/=
193.	ہندستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	ایچ۔ این۔ سنہا / پروفیسر محمد سلیم قدوائی	۹۵/=
194.	ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی۔ سی۔ سرکار / ملیحہ سمیع الزماں	۴۹/=
195.	ہندوستانی مصوری ایک خاکہ	انیس فاروقی	۱۳۰/=
196.	ہندوستانی مصوری (عہد مغلیہ میں)	پرسی براون / عبید الحق	۱۵۸/=
197.	ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں (دوسری طباعت)	کنور محمد اشرف / قمر الدین	۲۰/=
198.	ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس	حبیب اللہ / مسعود الحسن	۲۵/=
199.	یوروپ کے عظیم سیاسی مفکرین	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۱۸۹/=

تذکرۂ مخطوطات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
200.	تذکرۂ مخطوطات (حصہ اوّل)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
201.	تذکرۂ مخطوطات (حصہ دوم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
202.	تذکرۂ مخطوطات (حصہ سوم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
203.	تذکرۂ مخطوطات (حصہ چہارم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
204.	تذکرۂ مخطوطات (حصہ پنجم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=

لسانیات، لغات، قواعد اور کتب خانہ داری

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
205	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۳۰۰/=
206	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ دوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۴۵۰/=
207	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۴۵۰/=
208	آہنگ اور عروض	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۱۸/=
209	انٹروڈکٹری اردو (I)	سی ایم نعیم	۵۶/=
210	انٹروڈکٹری اردو (II)	سی ایم نعیم	۵۶/=
211	املا نامہ	مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	۹/=
212	اردو تصویری لغت	شیاملا کماری / ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	۳۰/=
213	اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خاں	۴۴/=
214	اردو افعال	سونیا چرنیکوا	۲۴/=
215	اردو املا	رشید حسن خاں	۱۳۵/=
216	اسکول لائبریری	سید حسین رضا رضوی	۲۰/=
217	جامع انگریزی اردو لغت A-C (حصہ اوّل)	کلیم الدین احمد	۴۰۰/=
218	جامع انگریزی اردو لغت D-G (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
219	جامع انگریزی اردو لغت H-N (حصہ سوم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
220	جامع انگریزی اردو لغت (O-Q) (حصہ چہارم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
221	جامع انگریزی اردو لغت R-S (حصہ پنجم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
222	جامع انگریزی اردو لغت T-Z (حصہ ششم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
223	توضیحی لسانیات	ایچ. ایل. گلیسن / عتیق احمد صدیقی	۲۳/=
224	زبان و قواعد	رشید حسن خاں	زیر طبع
225	صحت الفاظ	سید بدر الحسن	۶۳/=
226	صوتیات فونیمیات	پروفیسر اقتدار حسین	۲۴/=
227	عام لسانیات	پروفیسر گیان چند جین	۷۵/=
228	عشری درجہ بندی	سیلوں ڈیوی / سید محمود حسن قیصر	۱۶۷/=
229	عہدۂ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	کے۔ سی۔ ہیڈسن / مہ جبیں اختر	۲۲/=
230	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	۲۷/=
231	فرہنگ آصفیہ (۱)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=
232	فرہنگ آصفیہ (۲)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=

.233	فرہنگ آصفیہ (۳)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=
.234	فرہنگ اصطلاحات انسانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	زیر طبع
.235	فرہنگ اصطلاحات تاریخ وسیاسیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۴/=
.236	فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	قومی اردو کونسل	۳۱/=
.237	فرہنگ اصطلاحات حیوانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۲/=
.238	فرہنگ اصطلاحات ریاضیات (طبع ثانی)	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۱/=
.239	فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اور تعلیم	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۳۰/=
.240	فرہنگ اصطلاحات کیمیا	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۸/=
.241	فرہنگ اصطلاحات لسانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۰/=
.242	فرہنگ اصطلاحات معاشیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۰/=
.243	فرہنگ اصطلاحات نباتیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۵/=
.244	فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض / حسن علی جعفری	۳۸/=
.245	کتاب کی تاریخ	شایاں قدوائی	۱۳٫۵۰
.246	کتب خانہ داری ایک تعارف	شہاب الدین انصاری	۲۴/=
.247	لسانیات کیا ہے؟	ڈاکٹر ڈیوڈ کرسٹل / ڈاکٹر نصیر احمد خان	۱۱/=
.248	لسانی مطالعے ترمیم واضافے کے ساتھ (تیسرا ایڈیشن)	پروفیسر گیان چند جین	۲۲/=
.249	لغت ابجد شماری (جلد اوّل، حصہ اوّل)	سید احمد (سڈنی)	۸۵/=
.250	لغت ابجد شماری (جلد اوّل، حصہ دوم)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
.251	لغت ابجد شماری (جلد دوم، حصہ اوّل)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
.252	لغت ابجد شماری (جلد دوم، حصہ دوم)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
.253	مبادی کتابیات	شہاب الدین انصاری / کرشن کمار	۲۲/=
.254	مختصر اردو لغت	ترقی اردو بیورو	۲۶۰/=
.255	مفتاح التقویم (طبع ثانی)	حبیب الرحمان خاں صابری	۱۵۵/=
.256	نور اللغات (حصہ اوّل)	مولوی نور الحسن نیر	۳۰۰/=
.257	نور اللغات (حصہ دوم)	مولوی نور الحسن نیر	۲۵۰/=
.258	نور اللغات (حصہ سوم)	مولوی نور الحسن نیر	۲۳۰/=
.259	نور اللغات (حصہ چہارم)	مولوی نور الحسن نیر	۳۱۵/=
.260	نئی اردو قواعد	عصمت جاوید	۱۵/=
.261	وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	۱۸/=
.262	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی / پروفیسر عتیق احمد صدیقی	۱۳٫۵۰
.263	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	رولکر / علی ابن الحسین زیدی	۷٫۲۵
.264	ہندوستان کے زمانہ قدیم ووسطیٰ کے کتب خانہ	بمل کمار دت / رتاج عالم عابدی	۱۰٫۲۵

فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
265.	ابتدائی سماجیات	ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی	۶/۲۵
266.	ابتدائی نفسیات	سید محمد محسن / محمد رضوان احمد خاں	=/۶۱
267.	ابنارمل نفسیات	ایفرایم روزن / ذکیہ مشہدی	=/۴۲
268.	ادبیات شناسی	پروفیسر محمد حسن	۱۲/۵۰
269.	انسان اپنی تلاش میں	رولو مے / زاہدہ زیدی	=/۳۰
270.	اردو زبان کی تدریس (تیسری طباعت)	معین الدین	=/۴۰
271.	اشارات تعلیم	آسٹن / نورالحسن	=/۴۵
272.	اصول تعلیم (دوسری طباعت)	خواجہ غلام السیدین	=/۲۴
273.	اصول تعلیم اور عمل تعلیم	ڈی۔ ایس گارڈن / خلیل الرحمن اور سیفی پریمی	=/۶۹
274.	تجلی کا فلسفہ یوگ	مترجم کرشن کمار پاٹھک	=/۱۲
275.	تاریخ فلسفہ اسلام (طبع ثانی)	ٹ۔ ج۔ دی بوئر / سید عابد حسین	=/۵۰
276.	تاریخ فلسفہ سیاست	پروفیسر مجیب	=/۹۷
277.	تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این۔ داس گپتا / رائے شیو موہن لال ماتھر	=/۳۰
278.	تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ	سگمنڈ فرائڈ / ظفر احمد صدیقی	۱۰/۵۰
279.	تدریس تاریخ	خلیل الرب	=/۱۸
280.	تدریس جغرافیہ	محمد ضیاء الدین علوی	=/۲۰
281.	تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سلامت اللہ	=/۶۵
282.	تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	خواجہ غلام السیدین / ایم۔ ابوبکر	۱۲/۷۵
283.	تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری	عبدالمغنی مدہوش	۱۳/۷۵
284.	تعلیم سماج اور کلچر (دوسری طباعت)	اے، کے، سی، اتاوے / ڈاکٹر اختر انصاری	=/۶۱
285.	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینس / ڈاکٹر سلامت اللہ	=/۴۷
286.	تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	=/۶۵
287.	تعلیم کا عمل	جیروم۔ ایس برو / معین الدین	۵/۵۰

288.	تعلیم کے مقاصد اور وسائل	تھیوڈور بریملڈ/خلیل الرحمٰن	۱۸/=
289.	تعلیم (ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں)	ایس۔ایم۔جعفر/سعید انصاری	۸/۲۵
290.	ثانوی مدارس میں تدریس	نیلسن ایل، بوسنگ/مسرور علی، اختر ہاشمی	۶۰/=
291.	جدید ابتدائی منطق (طبع ثانی)	ایل موسن اسٹیبنگ/ ڈاکٹر سلطان علی شیدا	۵۷/=
292.	جدید ہندوستان میں ذات پات	ایم،این سرینواس/شہباز حسین	۸/۲۵
293.	جدید دنیا میں تعلیم	نیاز احمد اعظمی	۲۰/=
294.	جواہر پارہ کا ادراک / شنکر آچاریہ	شنکر آچاریہ / کرشن کمار پاٹھک	۸/=
295.	زمان و مکان	وزیر حسن عابدی	۱۵/=
296.	سماج اور تعلیم	محمد عبدالقادر عمادی	۵/۷۵
297.	سماجی فلسفہ کا خاکہ	جے۔ایس۔میکنیس زے	۲۲/=
298.	شخصیت کے نظریات	ساجدہ زیدی	۹۲/=
299.	شریمد بھگوت گیتا	مترجم: حسن الدین احمد	۳۸/=
300.	علم مدنیت کی تدریس	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۱/=
301.	علم طبیعیات اور جدید طریقۂ تعلیم	رضیہ شیخ نظام الدین	۲۱/=
302.	فلسفیانہ تجربہ ایک تعارف (طبع ثانی)	جان ہاسپرس/ایس، اے، شیدا	۱۲۰/=
303.	فلسفہ کے بنیادی مسائل	اے، سی، ایونگ / میر ولی الدین	۷۳/=
304.	قدیم ہندی فلسفہ	رائے شیو موہن لال ماتھر	۸۲/=
305.	کامرس کیسے پڑھائیں	محمد شریف خاں	۱۴/۵۰
306.	کپل کا فلسفہ سانکھیہ	(مترجم) کرشن پاٹھک	۳۰/=
307.	معاشیات کیسے پڑھائیں	ریاض شاکر خاں	۱۴/=
308.	مدرسۂ عمل	اڈولف فیریر / شیخ غلام حسین	۹/۷۵
309.	نسل اور نسلی امتیاز	عبدالقادر عمادی	۸/۵۰
310.	نفسیات جنوں (طبع ثانی)	برنارڈ ہارٹ / عبیدہ زمان	۳۸/=
311.	ہمارا قدیم سماج	سید یحییٰ حسن نقوی	۵۴/=
312.	ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت	سید حامد حسین	۹/=
313.	ہندوستانی گاؤں	شیاما چرن دوبے /عبدالقار عمادی	۱۷/=
314.	ہندوستان میں عورت کی حیثیت	آئی۔سی۔آر۔ /صغرا مہدی	۶۲/=
315.	ہندوستانی سماج ساخت اور تبدیلی	ضیاء الدین احمد	۳۸/=
316.	ہندی فلسفہ کے عام اصول	شیو موہن لال ماتھر	۱۸/=

معاشیات، تجارت

قیمت	مصنف / مترجم	کتاب	نمبر شمار
۱۷/۵۰	این، اے، جی، رابسن / ایم، اے، گیلانی	اجارہ	317
۱۰/۵۰	موریس ڈاب / عبدالرشید	اجرتیں	318
=/۱۰	رضیہ نظامی	اصول معاشیات	319
=/۳۵	چارلس پی کنڈل برجر / لیاقت علی خاں	بین الاقوامی معاشیات	320
=/۱۶	محمد باقر زیدی	تجارت بین الاقوامی و مبادلات خارجہ	321
=/۱۲	بشمبر / پروفیسر محمد سعید	دفتری انتظامیہ	322
۱۵/۷۵	ایل۔اے۔ باڈنگٹن / انجم الحسن	شماریات اوران کا استعمال	323
۴/۵۰	سیتارام ورما / زین العابدین	کامرس برائے سکنڈری اسکول	324
=/۷۶	کیو۔ ایچ۔ فاروقی	کھاتہ نویسی و کھاتہ داری (طبع ثانی)	325
=/۸۲	سراج الحسن	معاشیات کے بنیادی اصول	326
=/۲۲	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	ہندوستان اور مشرقی وسطی کے تجارتی تعلقات	327
=/۱۳	ڈی۔ آر۔ گیڈگل / ایم۔ صدیقی	ہندوستان کا صنعتی ارتقاء	328
۱۸/۷۵	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ اول) ۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۷ء	329
۵/۳۰	ایس کے بھٹناگر / محمد خلیل یامین	ہندوستانی معاشیات	330
۵/۳۰	برج کشور / این۔ کے۔ بھٹناگر	ہندوستانی معاشیات	331
=/۱۳۴	الک گھوش / محمد خلیق	ہندوستانی معیشت	332
۲۱/۵۰	رادھے شیام رنگٹا / غلام حیدر	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشنوں کا فروغ ۱۸۵۱ء تا ۱۹۰۰ء	333
۸/۷۵	نجم الحسن	ہندوستانی صنعتوں میں انصرام عملہ	334
=/۲۶	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	ہندوستان کی معاشی تاریخ (وکٹوریہ کے عہد حکومت میں 1837 تا 1900) (حصہ دوم)	335

سائنسی اور تکنیکی کتابیں

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
336.	آبیات	محمد ابراہیم	۱۰/=
337.	آسان اردو شارٹ ہینڈ	سید راشد حسین	۴۰/=
338.	ارضیات کے بنیادی تصورات	وائی ابرو چیف / پروفیسر ماجد حسین	۲۲/=
339	انسانی ارتقاء	ایم، آر، ساہنی / احسان اللہ	۷۰/=
340.	ایٹم کیا ہے؟	احمد حسین	۴/۵۰
341.	بائیو گیس پلانٹ	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۵/=
342.	برقی توانائی	انجم اقبال	۱۲/=
343.	پرندوں کی زندگی اور ان کی معاشی اہمیت	محشر عابدی	۱۱/=
344.	پیڑ پودوں میں وائرس کی بیماریاں	رشید الدین خاں	۶/۵۰
345.	پیمائش و نقشہ کشی	محمد انعام اللہ	۲۰/=
346.	تاریخ طبعی (حصہ اوّل)	پروفیسر شمس الدین قادری	۱۰/=
347.	تاریخ طبعی (حصہ دوم)	پروفیسر شمس الدین قادری	۲۴/=
348.	تاریخ ایجادات	ایگین لارسن / صالحہ بیگم	۳۰/=
349.	تکملی احصاء برائے بی۔اے۔، بی۔ایس۔سی۔	شانتی نرائن / سید ممتاز علی	۲۲/۲۵
350.	ٹرانسسٹر کے بنیادی اصول	سید اقبال حسین رضوی	۱۱/۲۵
351.	جدید الجبر اور مثلثات برائے بی۔اے۔	ایلمر ج پی۔ ونیس۔ ایس، اے، ایل، شیروانی	۱۵/=
352.	حیاتیات (حصہ دوم)	قومی اردو کونسل	۵/=
353.	خاص نظریۂ اضافیت	حبیب الحق انصاری	۱۲/=
354.	دھوپ چولھا	ایم۔ایم۔ہدیٰ / ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۲/=
355.	ڈپلوما کمپیوٹر اپلی کیشن و ملٹی لنگول ڈی ٹی پی	قومی اردو کونسل	۳۲/=
356.	راست و متبادل کرنٹ	عبدالرشید انصاری	۱۵/=
357.	سائنس کی باتیں	اندرجیت لال	۱۱/۵۰
358.	سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)	سکف اور سکف / انیس الدین ملک	۱۰/۵۰
359.	سائنس کی کہانیاں (حصہ دوم)	سکف اور سکف / انیس الدین ملک	۱۲/=

360.	سائنس کی کہانیاں (حصہ سوم)	سکلف اور سکلف / انیس الدین ملک	۵/=
361.	سائنس کی تدریس (تیسری طباعت)	ڈی این شرما / آر سی شرما / غلام دستگیر	۸۰/=
362.	سائنسی شعاعیں	ڈاکٹر احرار حسین	۱۵/=
363.	علم کیمیا (حصہ اول) (چھٹی طباعت)	مترجم: ڈاکٹر محمد سجاد رضوی	۵/=
364.	علم کیمیا (حصہ دوم)	مترجم: ارشد رضوی	۴/=
365.	فلسفہ، سائنس اور کائنات	ڈاکٹر محمود علی سڈنی	۵۵/=
366.	فن طباعت (دوسرا ایڈیشن)	بلجیت سنگھ مطیر	۱۱/۵۰
367.	فن خطاطی و خوشنویسی اور مطبع منشی نول کشور کے خطاط	امیر حسن نورانی	۳۶/=
368.	فن ضم تراشی	کملیش سنہا دنیش / اظہار عثمانی	۲۲/=
369.	کلاسیکی برق و مقناطیسیت مترجم: بی بی سکینہ	واف کانگ۔ ایچ پوفسکی میلیا فلپس۔	۵۰/=
370.	کوئلہ	نفیس احمد صدیقی	۲۲/=
371.	گنے کی کھیتی	سید مسعود حسن جعفری	۱۵/=
372.	گھریلو سائنس (حصہ ششم)	مترجم: شیخ سلیم احمد	۱۸/=
373.	گھریلو سائنس (حصہ ہفتم)	مترجم: ایس۔ اے۔ رحمان	۱۸/=
374.	گھریلو سائنس (حصہ ہشتم)	مترجم: تاجور سامری	۲۸/=
375.	گھریلو سائنس	طاہرہ عابدین	۳۵/=
376.	محدد جیومیٹری	گورکھ پرشاد اور ایچ، سی، گپتا / نثار احمد خاں	۳۵/=
377.	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	ڈبلیو ایچ مورلینڈ / جمال محمد	۳/۵۰
378.	مغل ہندوستان کا طریق زراعت	عرفان حبیب / جمال محمد	۳۴/۵۰
379.	موزوں ٹکنالوجی ڈائرکٹری	ایم۔ ایم۔ ہدیٰ / خلیل اللہ خاں	۲۸/=
380.	نوریات	ایف۔ ڈبلیو سیرس / آر۔ کے۔ رستوگی	۲۲/=
381.	ہندوستان کی زراعتی زمینیں اور ان کی زرخیزی	سید مسعود حسین جعفری	۱۳/=
382.	ہندوستان میں موزوں ٹکنالوجی کی توسیع کی تجویز	ایم۔ ایم۔ ہدی / ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۰/=
383.	منشی نول کشور اور ان کے خطاط و خوشنویس	امیر حسن نورانی	۱۳/=
384.	طبیعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیزر / احمد وکیل	

قانون

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
385	انتظامی قانون کے اصول	ایم۔پی۔ جین	زیر طبع
386	بھارت کا آئین	وزارت قانون وانصاف حکومت ہند	زیر طبع
387	ہندوستان کی قانونی تاریخ (حصہ اوّل)	ایس۔این۔ جین	۲۷/۷۵
388	ہندوستان کی قانونی تاریخ (حصہ دوم)	ایم۔پی۔ جین / انوار الیقین	۲۶/۵۰
389	موجز القانون	چاندپوری	۷۷/=

بچوں کا ادب

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
390	آدم زاد پری لوک میں	ضمیر درویش	۱۱/=
391	آرٹ کی کہانی	سیما پرویز	۱۲/=
392	اچھی چڑیا	محمد شفیع الدین نیر	۱۰/=
393	احمقوں کی جنت	شنکر / ڈاکٹر شریف احمد	۱۵/=
394	اخبار کی کہانی	غلام حیدر	۱۱/۵۰
395	ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	۱/۸۵
396	اوتیہ (سمندری لڑکا)	اغیاسرن / نامی انصاری	۲۲/=
397	اوڈیسی	ہومر / اطہر پرویز	۷/=
398	اڑنے والا گینڈا	منور ماجونا	۱۰/۵۰
399	اشوک کی پتنگ	مانگریٹ گڈ	۷/۵۰
400	اغوا اور دوسری کہانیاں	مرتب. گیتا مینن / منظور عثمانی	۳۲/=
401	اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النساء بیگم	۱۷/=
402	اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	۱۱/=
403	اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	۴/۵۰
404	انجان ملکوں کے کھوجی	ثریا جبیں	۱۲/=
405	ان سے ملئے (طبع ثانی)	منوہر ورما / طلعت عثمانی	۱۲/=
406	انوار سہیلی کی کہانیاں	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۱۰/۵۰

407.	انوکھی پہیلی	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	۱۵/=
408.	انوکھی کہانیاں	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۲/۲۵
409.	انوپالو رکالا کنواں	صالحہ عابد حسین	۳/۱۵
410.	لولیپک کیمس	صفدر حسین	۱۲/=
411.	اونٹ راجا	پریما راما شنکر	۴/۵۰
412.	ایشیا اور یورپ کی کہانیاں	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۴/۵۰
413.	ایک پرانا دوست	ہریندر سنگھ / فرحت عزیز	۱۵/=
414.	ایک دن کا بادشاہ	بازگو اطہر پرویز	۱۸/=
415.	ایک سہانی صبح باغ کی سیر اور دیگر ڈرامے	پارو آنند / محمد طاہر	۲۲/=
416.	ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	بازگو اطہر پرویز	۹/=
417.	اینڈرسن کی کہانیاں	بازگو اطہر افسر	۴/۵۰
418.	ایلیس آئینہ گھر میں	مترجم: عبدالحیٔ	۱۲/=
419.	بابرنامہ	مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
420.	باتیں کرنے والا غار	دولت ڈونگاجی / اے کے لوتگیا	۳/۵۰
421.	باپو اور بچے	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن / تاجور سامری	۲/۲۵
422.	بجلی کی کہانی	اے کے مورتی / نجمہ نقوی	۱۵/=
423.	بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	۳/۷۵
424.	بچوں کے ڈرامے	اظہر افسر	۱۰/۵۰
425.	بچوں کے لیے کچھ اور مختصر کہانیاں	عائشہ خاتون (مترجم)	۲۵/=
426.	بچوں کی کہانیاں	مترجم: تسنیمہ زیدی	۲۵/=
427.	بچوں کی مسکان	سیّدہ فرحت	۳/۷۵
428.	بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	۵/=
429.	بچوں کے نہرو	ایم چیلاپتی راؤ / پریم نارائن	۷/۵۰
429.	بکری دو گاؤں کھا گئی	م۔ ندیم	۹/=
430.	بگلا اور کیکڑا	الکا شنکر	۷/=
431.	بوڑھیا اور کوا	شنکر	۷/۵۰
432.	بوستاں کی کہانیاں	بازگو علقمہ شبلی	۱۵/=
433.	بے زبان ساتھی	وکیل نجیب	۱۰/=
434.	بیربل کی شوخیاں	ثریا جبیں	۸/=
435.	بے زبانوں کی دنیا	حیدر بیابانی	۱۸/=
436.	بینک کی کہانی	غلام حیدر	۴/۵۰
437.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ اوّل)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
438.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ دوم)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=

439.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ سوم)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
440.	بھکاری راجہ	کے شیو کمار / ساحر ہوشیار پوری	زیر طبع
441.	بھوت پریت	ترقی اردو بیورو	۱۰/=
442.	بیگم کنگرو کی تھیلی کے لیے ایک تحفہ	سکھنی گودندن / ریحانہ رضوی	۱۵/=
443.	پاپا بھالو کا اسکوٹر	گیتا دھرم راجن / کے پی رائے زادہ	۱۵/=
444.	پانی کا جہاز اور اس کی تکنیک	نوکلا رائے / اسلم پرویز	۱۲/=
445.	پائلٹ کرسٹوفر	رونیا گاندھی / مترجم: صدف زیدی	۱۵/=
446.	پتھروں کے دل	وشاکا چھنی / غلام حیدر	۱۲/=
447.	پٹکی چلی چین	سگرون سری واستوا / فرحت عزیز	۱۵/=
448.	پردیسی	پرتھاناتھ / آصف نقوی	۱۵/=
449.	پریم چند	پروفیسر قمر رئیس	۱۱/۵۰
450.	پریم چند کی کہانیاں	جوگندر پال	۲۵/=
451.	پسند	مایا تھامس	۹/۵۰
452.	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ اول)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	زیر طبع
453.	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ دوم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	زیر طبع
454.	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ سوم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	۵/۷۵
455.	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ چہارم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	۷/=
456.	پودوں اور جانوروں کی دنیا	اطہر پرویز	۲/۵۰
457.	پوربی دیسوں کی کہانیاں	کلا تھیرانی / عائشہ صدیقی	۱۹/=
458.	پیڑ راجا	دیپکا جیدکا / غلام حیدر	۱۵/=
459.	پیسے کی کہانی	اطہر پرویز	۳/۵۰
560.	پُراسرار پھول	لولین تھادانی / مترجم: انیس احمد	۱۵/=
461.	پھول مالا	سعادت نظیر	زیر طبع
462.	پھلواری	منیر الحق صدیقی	۸/۵۰
463.	ترقی اردو ریڈر	حیات اللہ انصاری	۱۴/=
464.	تین مچھلیاں	دولت ڈونگاجی / اے۔ اے۔ لونگیا / این۔ این۔ مجمدار	۵/۵۰
465.	ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	نوکلا رائے / مترجم: شبانہ اسلام	۱۲/=
466.	ٹیلی ویژن اور اس کی تکنیک	نوکلا رائے / مترجم: عارف نقوی	۳۵/=
467.	جانداروں اور جانوروں کی عجیب و غریب عادتیں اور خصلتیں	راجندر کمار راجیو / مترجم: ایس۔ اے۔ رضوی	۲۸/=
468.	جادوئی سرکس	شاما مکرجی / مترجم: آصف نقوی	۱۵/=
469.	جانور اور ان کے بچے	ڈی۔ سی۔ سوالائی	۲/۲۵

470.	جمبو کی تربیت	آر۔ کے۔ مورتھی	۷/=
471.	جنوبی وسطی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	۱۰/=
472.	چار بہرے آدمی	شنکر / نجمہ نقوی	۱۵/=
473.	چار درویشوں کا قصہ	باز گو نور الحسن نقوی	۱۱/=
474.	چنکو	سریکھا پانندیکر	۹/۵۰
475.	چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	۱/۵۰
476.	چڑیا اور راجہ	مدھو ٹنڈن	۷/=
477.	چڑیاں	سلطان آصف	۳/=
478.	چڑیا گھر کی بلغ	ہری گوپال سوامی شری نواسن / مترجم: نجمہ نقوی	۱۵/=
479.	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
480.	چلتا پھرتا درخت	دیپا اگروال / شمیم جہاں	۱۵/=
481.	چلو چاند پر چلیں	جے پرکاش بھارتی / ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	۵/=
482.	چمکی نے خط ڈالا	مترا پھوکن / عائشہ خاتون	۱۵/=
483.	چندا ماما کے گاؤں میں	قاضی مشتاق احمد	۱۵/=
484.	چندر دیو	ایم لتا / کشور سلطان	۳/=
485.	چوبیس مختصر کہانیاں	عارف نقوی	۴۰/=
486.	چھوٹو نے تیرنا سیکھا	سپنادت / مترجم: شہناز اقبال	۱۵/=
487.	چیکو کی تتلی	سمیع مسعود خاں / ڈاکٹر شریف احمد	۱۵/=
488.	حاتم طائی کا قصہ	مرتب: نور الحسن نقوی	۱۳/=
489.	حالی	صالحہ عابد حسین	۴/=
490.	حرف حرف نظم	وقار خلیل	۵/=
491.	خط کی کہانی	غلام حیدر	۱۱/=
492.	خطرناک راستے	وکیل نجیب	۹/۵۰
493.	خواب مشین	سہر گھوش / رچا بنسل / اقبال مہدی (مترجم)	۲۴/=
494.	خواجہ میر درد	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
496.	خوب بچالیا	آر کے مورتی / ڈاکٹر شریف احمد	۱۵/=
496.	دادی کی سازی	آشا نیمیا / مترجم: ڈاکٹر صغرا مہدی	۱۵/=
497.	دوست بنائے نئے نئے	الکا شنکر / مترجم: نجمہ نقوی	۲۰/=
498.	دھمیل کی دم میں	ممتا پانڈیا / مترجم: سید شاہ ناز عباس	۱۵/=
499.	دلچسپ کہانیاں	ڈاکٹر رام آسراراز	۱۵/=

500.	دلکش نظمیں	ابرار کرت پوری	۶/=
501.	دھنک کا جھولا	مکتا مجل / زاہدہ خاتون	۱۵/=
502.	دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۶/۵۰
503.	ڈارون کا نظریۂ ارتقاء	ڈاکٹر افتخار احمد	۷/۵۰
504.	ڈاکٹر راجندر پرشاد	عبداللطیف آعظمی	۱۱/=
505.	ڈاکیہ	آر کے مورتی / نجمہ نقوی	۱۵/=
506.	ڈیوی ڈیلز کا نیا طالبِ علم	میتھیو پائمکٹ / زاہدہ خاتون	۳۰/=
507.	رابن ہڈ کے کارنامے	تلخیص و ترجمہ ایم۔ ندیم	۱۵/=
508.	رابنس کروسو	ڈینیل ڈیفو / م۔ ندیم	۱۳/=
509.	راجو اور اکبر	جین بوجور	۴/۷۵
510.	راجہ رام موہن رائے	سچندر لال گھوش / انعام الحق	۳/۵۰
511.	راجو کا مزے دار تماشا	بی۔ فاطمی / مترجم: کمال احمد زیدی	۱۵/=
512.	ربن	سوکمار شنکر / کے پی رائے زادہ	۱۵/=
513.	رتن ناتھ سرشار	پریم پال اشک	۴/۲۵
514.	ریل گاڑی کیسے کام کرتی ہے	نوکا رائے / مترجم: تسکین زیدی	۱۲/=
515.	رینگنے والے جانور	قیصر سرمست	۱۲/=
516.	سات رانیاں	شنکر	زیر طبع
517.	سب کے باپو	سلطان آصف فیضی	۴/۵۵
518.	سجاتا اور جنگلی ہاتھی	شنکر / ایس۔ ایم۔ شاہنواز	۴/=
519.	سچی کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	۱۲/=
520.	سرسید احمد خاں	میر نجابت علی / سید ابوالحسنات	۷/=
521.	سنہری ہرن	شنکر	۹/۵۰
522.	سنو کہانی	منصور نقوی	۳۰/=
523.	سوڈان کی مزے دار کہانیاں	محمد امین	۸/۵۰
524.	سڑک کی کہانی	پوائلی سین گپتا / ریحانہ رضوی	۱۵/=
525.	سونالی کا دوست	شنکر	۷/=
526.	شاہنامہ کی کہانیاں	بازگو ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی	۱۱/=
527.	شریف زادہ	حفیظ عباسی	۱۳/=
528.	شکاری شکار اور جنگل سے پیار	رضیہ تحسین	۱۱/=
529.	شہنشاہ اثمار آم	تاباں نقوی امروہوی	۱۱/=
530.	شیر اور خرگوش	شنکر	۷/=
531.	صبح کی پری	رتن سنگھ	۳/=
532.	صفر کی کہانی	دلیپ ایم سالوی پروفیسر طلعت عزیز (مترجم)	۱۲/=

533.	عظیم سائنس داں	ڈاکٹر احرار حسین	۱۸/=
534.	عقل مند مچھیرے اور دوسرے ڈرامے	مرتب: م۔ ندیم	۷/=
535.	فٹ بال کی کہانی	مترجم: راج نرائن راز	زیر طبع
536.	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۱۶/=
537.	فضائی اور خلائی اڑان	شاداں پرویز	۳/۲۵
538.	قصہ ہائے رنگ رنگ	صمد بہرنگی / شعیب اعظمی	۲۹/=
539.	کٹھ پتلی ایک تماشہ	سطوت رسول	۷/=
540.	کچھوا اور ہنس	شنکر	۷/=
541.	کچھ ہندستانی چڑیاں	این۔ این۔ مجمدار / آصف نقوی	۳۲/=
542.	کیمیا کی کہانی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۶/=
543.	گاندھی اہنسا کا سپاہی	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن / محمد حسین قدوائی	۱۲/۵۰
544.	گاندھی جی کے مختلف روپ	الوبندھوپادھیائے	۱۵/=
545.	گڈو میاں	نور الحسنین	۶/=
546.	گلابی اور نیلے پنکھ والی جانو تلی	تھنگم کرشنن / مترجم: نجمہ نقوی	۱۵/=
547.	گلستاں کی کہانیاں (طبع ثانی)	امیر حسن نورانی	۱۴/=
548.	گھڑی کیسے کام کرتی ہے	نوکلارائے / شبانہ اسلام	۱۲/=
549.	لڑھکتا پہیا	آشا کھیمیا / مترجم: ڈاکٹر صغرا مہدی	۱۵/=
550.	للی پٹ کا سفر	جوناتھن سوئفٹ / م۔ ندیم	۲/۱۰
551.	لمبو اور موٹو	منورما جوتا	۵/۵۰
552.	مالوے کی لوک کہانیاں	ڈاکٹر صادق	۵/۵۰
553.	محمد حسین آزاد	نند کشور وکرم	۵/=
554.	مچھلیاں اڑنے لگیں!	اڈوانی تعدانی / تسنیمہ زیدی	۱۲/=
555.	مرزا عظیم بیگ چغتائی	ڈاکٹر ہارون ایوب	۱۲/=
556.	مشینی گھوڑا	بازگو اطہر پرویز	۱۴/=
557.	مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں	محمد امین	۹/=
558.	ممانی کا کارنامہ	مترا پھوکان / مترجم: خسرو متین	۱۵/=
559.	منٹو اور آکلو	شیریں نیازی	۱۲/=
560.	منو کی کہانی	ایچ۔ م۔ سالوی / پروفیسر طلعت عزیز	۱۲/=
561.	مولانا روم کی کہانیاں	مرتب: محمد حفیظ الدین	۲/۵۰
562.	میرے غبارے	نوین مینن / زاہدہ خاتون	۱۵/=
563.	میگھ ناتھ ساہا	کملیش رے / مترجم: ایس کے۔ سنگھ	زیر طبع

.564	موہن جوداڑو کی مایا	ملک راج آنند	زیر طبع
.565	مہاگری	مرتب حفیظ الکبیر پرواز	۳/۷۵
.566	میر تقی میر	پروفیسر نثار احمد فاروقی	زیر طبع
.567	میری والدہ	سکرن سری واستوا	۹/۵۰
.568	میں کیا بنوں گا	میری لن ہرش	۹/۵۰
.569	ناگ متی	ساوتری / سلمیٰ اجمیری	۳/=
.570	نصوح کا خواب	مرتب حفیظ عباسی	۳/۵۰
.571	ننھی جل پری	ہانس کرسٹیاں انڈرسن/ ہرچرن چاولہ	۵/۵۰
.572	ننھے منے گیت	کیدار ناتھ کومل	۱۳/=
.573	ننھیال میں گزرے دن	شنکر / مترجم حیدر جعفری سید	۲۳/=
.574	نورتن کی کہانیاں	بازگو شمیم احمد	۲۰/=
.575	نور جہاں	ایم۔ آر۔ کوہلی	۷/=
.576	نیا کلینڈر اور دوسری کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	۷/=
.577	نہرو کے ان دیکھے روپ	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن /	۱۳/=
.578	وائی اور بھوت	دیویکا رنگاچاری / مترجم شمیمہ بیگم	۱۵/=
.579	وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	۱۰/=
.580	وفادار نیولا	شنکر	۷/=
.581	ہاتھی اور پانی کی تتلیاں	شاھا مکرجی / عائشہ خاتون	۱۵/=
.582	ہری اور دوسرے ہاتھی	شنکر / پریم نارائن	۶/=
.583	ہمارا سنیما	پریم پال اشک	۱۰/=
.584	ہمارا قومی گیت	سید محمد ابراہیم فکری	۱۰/=
.585	ہماری لوک کہانیاں	پریم پال اشک	۱۸/=
.586	ہمارے نیگور	صفدر حسین	۸/۵۰
.587	ہمارے جانباز	پریم پال اشک	۱۳/=
.588	ہمالیہ کے نظارے	شیام سنگھ ششی	۶/۵۰
.589	ہندوستان کی آبادی	محمد ابوذر	۸/۷۵
.590	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اول)	صفدر حسین	۱۵/=
.591	ہندوستان کی عظیم عورتیں	صفدر حسین	۱۵/=
.592	ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ (حصہ دوم)	شنکر / خسرو متین	۳۷/=
.593	ہندوستان کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین	پی۔ ٹی۔ شیخ علی	۱۳۱/=
.594	ہندوستان کے قبائلی بچے	ڈاکٹر ششی / رام پرکاش راہی	۱۱/۹
.595	ہوائی جہاز اور اس کی تکنیک	نوکاراے / مترجم سید رضا حیدر	۱۲/=
.596	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ دوم)	صفدر حسین	۱۵/=

597.	ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ (حصہ اوّل)	شنکر / خسرو متین	۳۷/=
598.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۱)	اقبال مہدی زیدی	۳۵/=
599.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۲)	مترجم: سبط اصغر رضوی	۳۵/=
600.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۳)	مترجم: غلام حیدر	۳۵/=
601.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۴)	غلام حیدر (مترجم)	۳۵/=
602.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۵)	رفیق محمد شاستری	۳۵/=
603.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (6)	مترجم: محمد عمر برنی	۳۵/=
604.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۷)	فرحت قمر	۳۵/=
605.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (8)	مترجم: صفدر نقوی	۳۵/=

طب و معالجات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
606.	امراض النساء (چوتھا ایڈیشن)	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۱۵۰/=
607.	امراض الاطفال	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۹۲/=
608.	امراض اور ان کی حقیقت	حکیم ایم۔ حسام صدیقی	۲۳/=
609.	بچے کی صحت	ڈاکٹر مس ستیہ گپتا / شمیم نکہت	۲/=
610.	پیٹ کے کیڑے	محمد رفیق اے۔ایس	۳۰/=
611.	تاریخ طب	حکیم محمد حسان	۱۱۰/=
612.	تشریح الہیکل (اول)	حکیم ایس۔ ایم۔ کمال الدین حسین ہمدانی	۱۱/=
613.	تشریح الاحشاء	حکیم ایس۔ ایم۔ کمال الدین حسین ہمدانی	۲۳/=
614.	تیمارداری، (ترمیم و اضافے کے ساتھ) (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر حسین فاروقی	۱۶/=
615.	چائنیز طب آکیوپنکچر اور موکسی بوشن کے بنیادی اصول	ڈاکٹر محمد ظہیر الدین	۱۲/=
616.	چند عام بیماریاں	حسین فاروقی	۹/=
617.	درد۔ علامت اور علاج	حکیم ابو سعد خالد جاوید شمسی	۱۷/=
618.	سرطان کیا ہے؟	محمد برہان حسین	۷/=

.619	شراب نوشی اور منشیات کی لت	ڈاکٹر حسین فاروقی	۸/=
.620	علاج بذریعہ غذا	حکیم احتشام الحق قریشی	۱۲۱/=
.621	علم الادویہ (حصہ سوم)	حکیم محمد مستان علی	۴۶/=
.622	عہد مامون کے طبی و فلسفیانہ ترجمہ کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر عشرت اللہ خاں	۴۰/=
.623	فطری علاج	حسن الدین احمد اور غلام احمد	۱۶/=
.624	قبالیات	محمد عباس رضوی	۶۲/=
.625	قدیم علم الامراض	حکیم وامق ملک امین	۳۴/=
.626	کتاب المرشد	محمد بن زکریا رازی / محمد رضی الاسلام ندوی	۱۵/=
.627	کلیات نبض و بول و براز	حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن	۴۷/=
.628	ماہیت الامراض	ڈاکٹر سید اسد رضا زیدی	۴۰/=
.629	مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر	حکیم الطاف احمد اعظمی	۱۱/=
.630	معالجات (حصّہ اوّل)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۰۴/=
.631	معالجات (حصّہ دوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۴۸/=
.632	معالجات (حصّہ سوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۲۰/=
.633	معالجات (حصّہ چہارم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۰۰/=
.634	میزان الطب	حکیم محمد اکبر	زیر طبع
.635	موجز القانون	مترجم۔ کوثر چاند پوری	۲۰/=
.636	نسائیات (طبع ثانی)	حکیم سیّد محمد عباس رضوی	۶۲/=
.637	ہماری غذا	شکیل احمد	۹/۵۰
.638	ہمارے جسم کا موجزاتی نظام	قیصر سرمست	۳۳/=
.639	ہندوستان کے مشہور اطباء	حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن	۱۸/=
.640	یونانی طب میں مانع حمل ادویہ اور تدابیر	حکیم امّ الفضل	۱۲/=
.641	یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	۶۰/=
.642	اصول طب	سید کمال الدین حسین ہمدانی	۱۱۶/=
.643	پیڑ پودوں پر وائرس کی بیماریاں	رشید الدین خاں	۶/۵۰
.644	ذہنی حفظان صحت	مترجم: ہیرالڈ ڈبلو برنارڈ / معین الدین	۶۰/=
.645	منشیات	محمد رفیق اے ایس	۴۰/=

Subscribe "Urdu Duniya" Today

سالانہ خریداری فارم

زرِ سالانہ : 100 روپے

میں "اردو دنیا" کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔
100 روپے کا ڈرافٹ /125روپے کا چیک نمبر .... بتاریخ ....
بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ "اردو دنیا" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام ....
پتہ ....
....
.... فون : ....

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جا سکتی ہے۔

Subscribe "Fikr-O-Tehqeeq" Today

سالانہ خریداری فارم

زرِ سالانہ : 100 روپے

میں "فکر و تحقیق" کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔
100 روپے کا ڈرافٹ /125 روپے کا چیک نمبر .... بتاریخ ....
بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ "فکر و تحقیق" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام ....
پتہ ....
....
.... فون : ....

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جا سکتی ہے۔

Registered with the registrar of News Papers for India RNI NO. 69302/98

Quarterly *Fikr-O-Tahqeeq* New Delhi

Vol. III April, May, June 2000 Issue - 2 ☎: 6103381

National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Education, Ministry of Human Resource Development,
Government of India, West Block - I, R.K. Puram, New Delhi

دنیائے اُردو میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے

● کوئی کتاب چھپتی ہے ● کوئی رسالہ نکلتا ہے ● کوئی تقریب ہوتی ہے ● نصابی کتابوں کی فراہمی ● تکنیکی اصطلاحات کے معاملات ● لغات کی تدوین ● اُردو میڈیم طلباء کی دشواریاں ● اُردو تعلیم و تدریس کے مسائل ● قومی اُردو کونسل کی سرگرمیاں ● دوسرے رضاکار اُردو اداروں مثلاً اُردو اکادمیوں کی سرگرمیاں ● کتابوں پر انعامات ● ادیبوں کو اعزاز، اکرام استقبالیہ ● معاصر اخبارات سے اُردو کے متعلق اہم خبریں ● اہم مضامین ● فروغ اُردو کے نئے امکانات ● افکار و اذکار ● تبصرے ● اہم مضامین اور اُردو زبان و ادب کی ہمہ جہت ترقی کے امکانات و مسائل پر گفتگو اور مذاکرے وغیرہ کے ساتھ کلاسیکی ادب کے نثری اور منظوم شہ پاروں پر مشتمل ماہنامہ **اردو دنیا** دہلی سب کچھ ریکارڈ کرتا ہے اور خوب صورتی کے ساتھ اپنے قارئین کے لیے پیش کرتا ہے۔
آج ہی طلب کیجیے۔

فی شمارہ 10 روپے زرِ سالانہ 100 روپے۔ کتب فروشوں کے لیے 5 سے زیادہ کاپیاں منگوانے پر 40 فیصد کی رعایت دی جائے گی۔

Printed, Edited, and Published by Dr. M. Hamidullah Bhatt Director, National Council For Promotion Of Urdu Language at Liberty Art Press, Darya Ganj, New Delhi-110002. and published from West Block I, R.K. Puram New Delhi. Owner NCPUL, Dept. of Education M/o HRD. Government of India.